دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۷ ماہ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۱۱ء عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

وسائل کے یکسر فقدان کے باوجود محض توفیق ایزدی کے سہارے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی تعمیر نو اور اس کی عظمت رفتہ کی بازیافت کے مقصد سے جس مہم کا آغاز مارچ ۲۰۰۸ میں کیا گیا تھا حوصلہ شکن موانع اور مشکلات کے باوجود بحمداللہ وہ اب بھی اسی عزم و حوصلہ کے ساتھ جاری ہے۔البتہ مشکل یہ ہے کہ قوم کو اس طرح کے اداروں کی اہمیت اور ضرورت کا ادراک نہیں۔اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملت کے باشعور، حساس اور دردمند افراد کو دارالمصنفین کی تاسیس کے پیچھے کارفرما مقاصد، اس کی تاریخ اور خدمات اور اس کی موجودہ صورت حال سے روشناس کرایا جائے اور ان کی توجہ ان منصوبوں کی طرف دلائی جائے جو دارالمصنفین کے پیش نظر ہیں۔ اس سے کچھ کرنے کا جذبہ بیدار ہوگا اور اس طرح دست سوال دراز کرنے کی شرمندگی نہ اٹھانی پڑے گی۔اسی ضرورت کے تحت اس سے پہلے مسقط، متحدہ امارات اور بحرین کا سفر کیا گیا تھا اور اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے تھے۔اسی مقصد سے گذشتہ دنوں اکیڈمی کے ایک وفد نے ممبئی کا سفر کیا۔اس وفد میں راقم حروف کے علاوہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور جناب عرشی نعمانی شامل تھے۔اندرون ملک یہ پہلا سفر تھا۔ممبئی سے علامہ شبلی اور ان کے واسطہ سے دارالمصنفین کا جو تعلق رہا ہے اس کا تقاضا بھی یہی تھا۔یہ وفد ۱۰ جنوری سے ۲۰ جنوری تک ممبئی میں رہا۔اس دوران میری علالت کے باوجود بڑے پیمانے پر اکیڈمی کے تعارف کی سبیل پیدا ہوئی۔کسی حد تک وسائل کی فراہمی کی بھی صورت پیدا ہوئی اور اس سے بھی زیادہ مستقبل کے لیے نئے امکانات روشن ہوئے۔دارالمصنفین کے قدردانوں نے جس محبت اور تعلق خاطر کا مظاہرہ کیا اس سے ایک نیا حوصلہ ملا۔

اس سفر کو کامیاب بنانے میں بہت سے احباب اور بہی خواہان دارالمصنفین کا حصہ ہے لیکن اس کی منصوبہ بندی اور اس کے مطابق اس کی تعمیل اور تکمیل کا کام بنیادی طور پر مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری نے کیا۔مولانا عمری دارالسلام، عمرآباد اور مدینہ یونیورسٹی کے فاضل اور رفیق کی حیثیت سے برسوں دارالمصنفین سے وابستہ رہے ہیں۔یہاں ان کے قیام کی یادگار ان کی کتاب ''تذکرۂ مفسرین ہند'' ہے جو دارالمصنفین کی مطبوعات میں شامل ہے۔اس سفر کو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز بنانے کے لیے انہوں نے باہمی مشورہ سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شروع سے آخر تک وفد کے ساتھ رہے۔ان کے والد ماجد اور میرے زمانہ طالب علمی کے دوست اور جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کے فعال صدر مولانا مستقیم احسن اعظمی، کے لیے ہمارے قیام کا زمانہ بوجوہ بہت مصروفیت کا وقت تھا۔اس کے باوجود انہوں نے حدود ممبئی میں ہونے والے تمام پروگراموں میں شرکت کی اور انہی کی رہنمائی اور معیت میں زیادہ تر انفرادی ملاقاتوں کا اہتمام کیا گیا۔واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ راقم حروف سے قدیم تعلق کا حق جس طرح ادا کیا وہ انہیں کا حصہ ہے۔

احباب اور بہی خواہان دارالمصنفین نے کئی ایسے پبلک پروگراموں کا اہتمام کیا جس سے بڑے پیمانے پر دارالمصنفین کے تعارف اور اس کے مسائل سے آگاہی کی سبیل پیدا ہوئی۔اس سلسلہ کا پہلا پروگرام ممبئی کے

مشہور اہل قلم اور شاعر جناب شمیم طارق نے کریمی لائبریری کی افتتاحی تقریب کی نسبت سے ۱۰ جنوری کو منعقد کیا۔ ایک مدت کے بعد اس لائبریری کو جناب شمیم طارق کی نگرانی میں نئی زندگی ملی ہے۔ اس تقریب میں انہوں نے راقم حروف کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کر کے عزت بخشی اور اس طرح عروس البلاد میں دارالمصنفین کے تعارف کا اولین موقع فراہم کیا۔ اس کی صدارت انجمن کے سکریٹری جناب معین الحق چودھری نے کی۔ دوسرا پروگرام جناب شمیم طارق کی تحریک پر رحمت فاؤنڈیشن کی طرف سے ڈاکٹر انور امیر صاحب نے اسلام جمخانہ میں منعقد کیا۔ ڈاکٹر انور امیر صاحب ممبئی کے مشہور ہومیو پیتھ معالج ہیں اور سماجی اور رفاہی کاموں میں بہت سرگرم ہیں اور رحمت فاؤنڈیشن کے ذریعہ کمزور اور ضرورت مند لوگوں کی خاموشی سے مدد کرتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام دارالمصنفین کے خدمت گذاروں کے لیے استقبالیہ کے طور پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت اعظم کیمپس، پونہ کے صدر جناب منور پیر بھائی نے کی۔ اس مجلس کے مہمان خصوصی میرے پرانے کرم فرما مولانا حسان ندوی صاحب تھے۔ مولانا ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور خاکسار نے دارالمصنفین کی تاسیس کے پیچھے کارفرما مقاصد، اس کی تاریخ، خدمات اور مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروگرام کے بعد جملہ شرکاء کے لیے کھانے کا بھی انتظام تھا۔ اس نوعیت کا تیسرا پروگرام جناب زبیر اعظمی نے اردو مرکز میں منعقد کیا۔ گفتگو کے لیے انہوں نے ''دارالمصنفین - ماضی، حال اور مستقبل'' کا موضوع طے کیا تھا۔ صدارت مولانا مستقیم احسن اعظمی صاحب نے فرمائی۔ ممبئی کے علمی اور ادبی حلقوں میں اردو مرکز کی اپنی ایک شناخت ہے یہاں بھی اہل ذوق نے دارالمصنفین کے مسائل سے دلچسپی لی اور مفید مشورے دیے۔ پروگرام کے بعد جناب مستقیم مکی کے دولت کدہ پر کھانے کا انتظام تھا۔ مکی صاحب اردو کا ایک خوبصورت مجلّہ ''ہدی'' شائع کرتے ہیں۔ انور اعظمی صاحب اور ان کے رفقاء نے اندھیری کے علاقہ میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے شبلی نعمانی اسکول قائم کر رکھا ہے۔ اس علاقہ میں دارالمصنفین کو متعارف کرانے کے مقصد سے انہوں نے اس اسکول میں ایک نشست کا اہتمام کیا۔ اس کی صدارت کے فرائض جناب محمد ایوب واقف صاحب نے انجام دیے۔ اس نشست میں شرکت کے لیے ملت نگر سے مرزا اطہر بیگ صاحب اور سہیم نعمانی صاحب بھی تشریف لائے۔ یہ دونوں حضرات دارالمصنفین کی بہتری کے لیے فکر مند اور کوشاں ہیں۔ اس نشست میں تعارف کے علاوہ اکیڈمی کے لیے عملی تعاون کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ اس نوعیت کا آخری پروگرام اردو کے مشہور مصنف اور سابق صدر شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی پروفیسر عبدالستار دلوی نے، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی میں منعقد کیا اس کا عنوان تھا ''اردو کے علمی ادارے اور دارالمصنفین - خدمات مسائل اور حل''۔ اس میں خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رام پور رضا لائبریری کی تاریخ اور خدمات پر مقالے پڑھے گئے۔ دارالمصنفین کے تعارف کی سعادت ڈاکٹر الیاس الاعظمی اور خاکسار کو حاصل ہوئی۔ ان پروگراموں کے وسیلہ سے وسیع پیمانے پر دارالمصنفین کے تعارف کی سبیل پیدا ہوئی اور اس دوران اکیڈمی ممبئی کے پڑھے لکھے حلقوں میں موضوع گفتگو بنی رہی۔ ممبئی کے دو معروف اردو اخبارات ''انقلاب'' اور ''اردو ٹائمز'' نے رپورٹنگ کے ذریعہ دارالمصنفین کے پیغام کو وسیع تر حلقوں تک پہنچانے میں مدد کی۔

ممبر سازی اور عملی تعاون کے سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیاب پروگرام ملت نگر میں مرزا اطہر بیگ

صاحب کے گھر پر منعقدہ نشست میں ہوا۔ مرزا صاحب نے اسی مقصد کے تحت احباب کی ایک بڑی تعداد کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ سہیم نعمانی صاحب، مرزا اطہر بیگ صاحب، ابوسفیان صاحب اور دوسرے احباب کی دلچسپی اور کوشش سے یہ نشست بہت نتیجہ خیز رہی اور آئندہ کے لیے بھی امکانات پیدا ہوئے۔ اس نوعیت کا دوسرا کامیاب پروگرام وسئی میں ہوا۔ مولانا عارف عمری صاحب کی رہائش وسئی میں ہے۔ ان کی اور حاجی عبدالقیوم اعظمی صاحب کی خصوصی دلچسپی کی وجہ سے یہ کامیاب پروگرام منعقد ہوسکا۔

۱۶ جنوری کی شام کو یہ قافلہ بھیونڈی پہنچا۔ بد قسمتی سے وہاں پہنچتے ہی راقم حروف ملیریا کی زد میں آگیا اور وہاں کے پروگرام میں شرکت نہیں کرسکا۔ اس میں مولانا حسان ندوی صاحب، مولانا عارف عمری صاحب اور ڈاکٹر الیاس الاعظمی صاحب نے شرکت کی۔ یہاں کے احباب نے مولانا حسان ندوی صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی اور یہ طے کیا کہ بھیونڈی سے فنڈ کی فراہمی اس کمیٹی کی ذمہ داری ہوگی۔ اگر بہی خواہان دارالمصنفین اور جگہوں پر اس قسم کی کمیٹیاں بنالیتے تو اکیڈمی کے لیے ضروری وسائل کی فراہمی اتنا بڑا مسئلہ نہ رہ جاتی۔

ممبئی میں قیام کے دوران ان حضرات کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوچکا جن بزرگوں اور احباب نے اس مہم میں خصوصی دلچسپی لی، وفد کی پذیرائی کی، خود بھی تعاون کیا اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کیا ان میں مولانا شعیب کوٹی صاحب، رضوان فاروقی صاحب، ڈاکٹر محی الدین صاحب، ڈاکٹر آفتاب عالم خاں صاحب، شہباز صدیقی صاحب، مرزا اشرف الدین بیگ صاحب، افتخار جمالی صاحب، زیڈ آئی شاہد صاحب، مرزا انصار بیگ صاحب، ابو رافع صاحب، جلال ایڈوکیٹ صاحب، محمد سلیمان صاحب اور حاجی شمس الدین مرحوم کے صاحبزادگان محمد شاہد اور محمد ابراہیم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ابوعاصم اعظمی صاحب نے اس سے پہلے بھی میری درخواست پر ایم۔ پی فنڈ سے اکیڈمی کی مدد کی تھی۔ اس بار بھی انہوں نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور توقع کے مطابق تعاون کا وعدہ کیا۔ حاجی عبدالغنی اطلس والا صاحب کا دارالمصنفین سے بہت پرانا تعلق ہے۔ انہوں نے اس تعلق کی بھرپور پاسداری کی۔ اس سفر میں جن لوگوں نے بھی دامے، درمے، قدمے، سخنے اس مہم سے تعاون کیا ہم ان سب حضرات کے تہ دل سے ممنون ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان کو بہترین جزا دے۔ آمین

جناب محمد ایوب واقف صاحب اور ان کے اہل خانہ نے جس اصرار، خلوص اور محبت سے میزبانی کا حق ادا کیا اور عزیزی جلیس احمد اور ان کے اہل خانہ اور عزیزی جاوید نے علالت کے دوران جس طرح میری دیکھ ریکھ کی واقعہ یہ ہے کہ اس کے اظہار واعتراف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اللہ ان سب کو بہترین اجر سے نوازے۔ آمین

ممبئی بہت بڑا شہر ہے۔ دس دن کا وقت اس کے لیے یکسر ناکافی تھا۔ پھر بیماری کے باعث خاصا وقت ضائع ہوگیا اور اس کی وجہ سے متعدد پروگرام کینسل کرنے پڑے اور بہت سے احباب اور قدردانان دارالمصنفین تک رسائی ممکن نہ ہوسکی۔ اس کا ملال ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ اس سفر میں جو کامیابی ملی وہ بھی کم اہم نہیں لیکن اس کی اصل اہمیت دراصل ان امکانات میں مضمر ہے جن کا تعلق مستقبل سے ہے۔ یقین ہے کہ انشاء اللہ اس کے بہت اہم اور دوررس نتائج برآمد ہوں گے اور دارالمصنفین کی تعمیر نو میں ممبئی کا کردار بہت اہم ہوگا۔

مقالات

جمہوریت اور اسلام

جناب الطاف احمد اعظمی*

جمہوریت ایک سیاسی نظام ہے اور آج کل اس نظام کو کافی مقبولیت حاصل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے اچھا طرز حکومت ہے، یعنی عوام کی اکثریت کی رائے سے حکومت کا بننا اور اس کا بگڑنا۔ اس نظام میں انفرادی آزادی اور شخصی مساوات کے تصورات کو جو اہمیت دی گئی ہے اس کی وجہ سے اس کی طرف لوگوں کا التفات زیادہ ہے۔ بہت سے مسلم دانشور بھی اس طرز حکومت کے حامی ہیں۔

لیکن ہر دور میں اصحاب علم کی ایک بڑی تعداد نے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، جمہوریت کو ناپسند کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں عوام کی حاکمیت اور مطلق آزادی کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ غیر عقلی اور باعث فساد ہے۔

آیئے دیکھیں کہ جمہوریت میں کون سی خوبیاں اور خامیاں ہیں، نیز یہ بھی معلوم ہو کہ جمہوری نظام اور اسلام کے سیاسی نظام میں موافقت ہے یا مغایرت؟ لیکن اس سے پہلے جمہوریت کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لینا ضروری ہے۔

تاریخی پس منظر: موجودہ جمہوریت ارتقاء کے مختلف مدارج طے کر کے اس مقام تک پہنچی ہے۔ جمہوریت کا اولین گہوارہ یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں (City states) تھیں۔ ان ریاستوں میں ایتھنز کی شہری ریاست زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس جمہوری ریاست میں عوام کے منتخب نمایندے حکومت کرتے تھے۔ اس کے تمام شہری، سماجی اور سیاسی اعتبار سے مساوی حیثیت

---

* سابق پروفیسر، ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی۔

رکھتے تھے اور ان کو اپنی شہری اور سماجی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ ایتھنز کے سب سے بڑے مدبر پیرک لز (Perecles) نے اپنی مشہور ماتمی تقریر میں اس وقت کی جمہوریت کی جو تصویر کشی کی ہے اس میں حقیقی جمہوریت کے بنیادی خدوخال بالکل نمایاں ہیں۔ وہ کہتا ہے:

> ''ہمارا دستور جمہوری کہلاتا ہے، اس لیے کہ حکومت چند لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ ذاتی جھگڑوں میں ہمارا قانون س کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے اور انصاف کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑتا ہے اور ہماری رائے عامہ زندگی کے ہر شعبے میں جہاں کار نمایاں کا موقع ہو، ہنر کی قدر کرتی ہے، کسی فرقے کی رعایت سے نہیں بلکہ کام کی خوبی دیکھ کر۔ ہم سیاسی زندگی میں ہر ایک کو اپنا جوہر دکھانے کا موقع دیتے ہیں اور یہی اصول ہم اپنے روزمرہ کے باہمی تعلقات میں برتتے ہیں۔ ہمارا ہم سایہ اپنے مذاق کے مطابق خوشی منائے تو ہم اسے نہ تیکھی نظروں سے دیکھتے ہیں نہ برا بھلا کہتے ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی بدتمیزی کی حرکتوں سے پرہیز کرتے ہیں جن کی چوٹ چاہے دکھائی نہ دے مگر جن کے دل پر لگتی ہے، انہیں دکھ دیتی ہے۔ ملنے ملانے میں ہم بے ریا اور بامروت ہیں۔ مگر ہم اپنی ریاست کے انتظامی معاملات میں سختی سے قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ جو برسر اقتدار ہو ہم اس کا احترام کرتے ہیں اور اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں، خصوصاً ان کی جو مظلوموں کی حمایت میں بنے ہوں اور اس اخلاقی معیار کا بہت پاس رکھتے ہیں جس کی خلاف ورزی باعث شرم وندامت ہے''۔(۱)

ان خوبیوں کے باوجود یونان کی جمہوریت ناقص تھی، اس میں آفاقیت (Universality) کی روح موجود نہ تھی۔ صرف ریاست کے شہری طبقہ کو اس سے مستفید ہونے کا حق حاصل تھا اور وہ بھی ان ہی لوگوں کو جو ریاست کی حدود میں پیدا ہوئے ہوں، حالانکہ یہ طبقہ عددی اعتبار سے اقلیت میں تھا۔ جو لوگ ریاست کے پیدائشی باشندے نہیں تھے ان کو اور غلاموں کو کوئی قانونی

استحقاق حاصل نہ تھا، حالانکہ وہ اکثریت میں تھے۔ بہر حال یونان میں جمہوریت اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ایک طویل مدت تک موجود رہی۔

یونان کے بعد روم دوسرا ملک تھا جس نے جمہوری روایات کو آگے بڑھایا۔ رومی ریاست نے جمہوریت میں دو چیزوں کا اضافہ کیا۔ ایک یہ قانونی اصول کہ جمہور کی مرضی (Popular consent) ہی تمام سیاسی قوتوں اور فیصلوں کی بنیاد ہے، دوسرے یہ کہ تمام انسان مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ رومیوں کے نظریہ کے مطابق ریاست کی حیثیت ایک اخلاقی برادری (Moral community) کی تھی اور ملکی قانون کے مطابق اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ کسی طبقاتی امتیاز کے بغیر ہر شخص اور ہر طبقہ کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے۔

رومی ریاست کے زوال کے نتیجے میں جس نے یورپ کو سیاسی انتشار میں مبتلا کر دیا، جمہوریت اور اس کی روایات ایک مدت کے لیے پس پشت چلی گئیں۔ چرچ جو انسانی مساوات (Human brotherhood) کے نظریے میں یقین رکھتا تھا اور جس کے دروازے تمام انسانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے، جمہوری قدروں کی پاسبانی کرسکتا تھا، لیکن اس نے یہ کام نہیں کیا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد یعنی سولہویں صدی میں اس وقت یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ ایک بار پھر مغرب میں جمہوری عمل کا آغاز ہوگا جب مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح کلیسا کے نتیجے میں پاپائے اعظم کے اقتدار کا محل زمیں بوس ہوگیا اور جاگیرداری نظام کے زوال کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔

لیکن یہ امید، امید موہوم ثابت ہوئی۔ جاگیرداری نظام کے خاتمے کے نتیجے میں جوئی قومی ریاستیں وجود میں آئیں ان پر مطلق العنان بادشاہی (Absolute monarchy) کا تسلط قائم ہوگیا۔ خدائی اختیارات کے مالک بادشاہوں (Divine rights kings) نے حکومت کے تمام اختیارات و وسائل کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ایک مرکزی انتظامی نظام کے تحت ساری قوم پر آمرانہ تسلط قائم کرلیا۔ ان بادشاہوں نے عیاری سے کام لے کر دینی اور دنیوی دونوں طاقتوں کو خود اپنی ذات میں جمع کرلیا تھا۔ وہ خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جواب دہ نہ تھے، انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے کسی شخص کو بادشاہ کے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے کا

حق حاصل نہ تھا۔ اس ظلم و زیادتی میں بادشاہ کے ساتھ چرچ بھی شریک تھا۔ آزادی کی ہر آواز کو کچلنے میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک یہی صورت برقرار رہی اور جمہوریت کی حمایت میں اٹھنے والی ہر آواز کو مطلق العنانیت کے بھاری قدموں کے نیچے روند ڈالا گیا۔

انگلستان وہ پہلا ملک ہے جہاں سب سے پہلے جمہوری عمل کا آغاز ہوا۔ ۱۶۸۸ء کے انقلاب میں خدائی اختیارات کی مالک بادشاہی پر بندش عائد کی گئیں اور رفتہ رفتہ پارلیمنٹ کا اقتدار اعلیٰ بحال ہوا۔ پہلی بار آبادی کے ایک بڑے حصے کو حکومت سازی کے حقوق حاصل ہوئے اور عوام کے منتخب نمایندوں کو موروثی شرف و فضیلت کے حامل امراء (Lords) پر برتری حاصل ہوئی۔ اس انقلاب میں تاجر طبقہ یعنی بورژوا پیش پیش تھا، کیوں کہ انفرادی آزادی کا اصول ان کے لیے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔

فرانس ابھی تک طبقۂ امراء کی مطلق العنانیت اور اس کی زیادتیوں کا شکار تھا اور جب بھی جمہوری حقوق کی بازیابی کے لیے کوئی تحریک اٹھی تو اس کو طاقت کے بل پر دبا دیا گیا۔ لیکن بغاوت کی آگ برابر دلوں میں سلگتی رہی اور بالآخر وہ انقلاب برپا ہو گیا جو تاریخ میں انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہے۔ اس انقلاب سے فرانس میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور انسانی حقوق کے صحیح تصور سے لوگ آشنا ہوئے، جو تاریخ کے صفحات میں آج بھی منشور حقوق انسانی (Declaration of human rights) کی شکل میں موجود ہے۔ (۲)

اس منشور میں انسان کے فطری حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ تمام لوگوں کی ملکیت ہیں، ان پر کسی مخصوص گروہ کا اجارہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ان فطری حقوق میں ضمیر اور اظہار رائے کی آزادی، مساوات اور جمہور کی فرماں روائی (People sovereignty) اور ہر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے کا حق جیسے امور شامل تھے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ انقلاب فرانس کے نتیجے میں ہول ناک خوں ریزی اور بے پناہ ظلم و سفاکیت کے واقعات پیش آئے۔ اس کا سب سے الم ناک پہلو یہ ہے کہ جمہوری انقلاب جلد ہی دوبارہ ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس انقلاب نے انفرادی

آزادی اور حاکمیت عوام کے تصورات کی جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑی اور دنیا کی متعدد اقوام نے اس سے استفادہ کر کے جمہوری روایات کو آگے بڑھایا ہے۔

جمہوریت کی تعریف: جمہوریت (۳)(Democracy) دو یونانی لفظوں 'Demos' اور 'Cratea' سے مرکب ہے۔ اس کے معنی بالترتیب عوام اور طاقت کے ہیں۔ گویا جمہوریت اس نظام حکومت کو کہتے ہیں جس میں اقتدار یا قوت عوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں عوام ہی فرماں روا ہوتے ہیں۔

ارسطو نے جمہوریت کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس میں ارباب حل وعقد (Magistrates) کے انتخاب میں افراد کی کثیر تعداد شریک ہوتی ہے اور ان میں غریب بھی ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف مطلق العنان حکومت (Aristocracy) میں صرف امراء حکومت کرتے ہیں اور یہ تعداد چند افراد تک محدود ہوتی ہے۔(۴)

جمہوریت کی سب سے عمدہ تعریف وہ ہے جو ابراہم لنکن کی طرف منسوب کی جاتی ہے، یعنی: "Government of people, by the people, for the people" (عوام کی حکومت، عوام کے ذریعہ، اور عوام کے فائدے کے لیے)۔

جمہوریت کی یہ تعریف محض اس کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔ بعض اصحاب علم کے نزدیک جمہوریت ایک سماجی فلسفہ ہے اور اس لحاظ سے اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ انسانی شخصیت (Human personality) کا احترام ہے اور اس احترام کا مستحق سماج کا ہر فرد ہے۔ اس احترام میں پیدائش، امارت اور سماجی حیثیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کے عناصر ترکیبی: حاکمیت عوام، مساوات اور انفرادی آزادی جمہوریت کے اجزائے ترکیبی ہیں، ان ہی عناصر ثلاثہ سے مل کر جمہوریت کا پیکر بنا ہے۔ اگر ان میں سے ایک عنصر بھی غائب ہو جائے تو اس سے جمہوریت کا حسن مجروح ہوگا اور اگر تینوں ہی عناصر موجود نہ ہوں تو پھر وہ جمہوریت نہیں آمریت اور ملوکیت ہے۔ جمہوریت کے عناصر ثلاثہ کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

حاکمیت عوام: یہ جمہوریت کا سنگ بنیاد ہے۔ جمہوریت میں عوام ہی ملک کے اصلی

فرماں روا ہوتے ہیں۔ ان ہی کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جن لوگوں کو چاہیں اقتدار کی مسند پر بٹھائیں اور جن کو نہ چاہیں انہیں اس سے محروم کردیں۔ ان کی مرضی کے بغیر نہ کوئی حکومت بن سکتی ہے اور نہ ہی کوئی قانون منظور ہوسکتا ہے۔ غرض یہ کہ عوام ہی ملک و حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔

انفرادی آزادی: یہ جمہوریت کی روح ہے۔ جمہوری حکومت میں ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جو مذہب یا عقیدہ رکھنا چاہے اس کو رکھ سکتا ہے۔ کسی شخص یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے عقیدہ و مذہب میں مداخلت کرے۔ اسی طرح ہر شخص کو اجتماع، جماعت سازی اور اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے۔ جمہوری ریاست کے ہر فرد کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ حکومت پر تنقید اور اس کے کارپردازوں کا محاسبہ کرے تاکہ ان کی کج روی کا سدباب ہو۔

ہر مذہبی گروہ کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے اصول و نظریات کے مطابق اپنے مذہبی رسوم و رواج ادا کرے اور ملکی قانون کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی تہذیب و کلچر کو فروغ دینے کے لیے کوشش کرے۔ اسی طرح ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق پیشہ اختیار کرنے، تجارت کرنے اور اس سے نفع حاصل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ یہ حق بھی اس کو حاصل ہے کہ وہ اپنی محنت کی جائز کمائی سے ذاتی ملکیت بنائے اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس میں اضافہ کرے۔ جب تک ایک فرد کی آزادی ریاست کی سلامتی یا کسی دوسرے فرد کی آزادی کے لیے خطرہ نہ بنے، حکومت کو مداخلت کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

مساوات: طبقاتی حقوق (Class privileges) کے دور میں انسانوں کو پیدائش کے لحاظ سے مساوی حیثیت حاصل نہیں تھی بلکہ عزت واحترام اور حقوق کے لحاظ سے انہیں اشراف و اجلاف کے خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور یہ انسانیت کی تذلیل کے مترادف تھا۔ اس لیے جمہوریت میں اس بات پر کافی زور دیا گیا ہے کہ سماج کے تمام افراد باعتبار پیدائش مساوی ہیں، نسل و رنگ، ذات پات اور جائے پیدائش کے لحاظ سے ان کے درمیان کسی قسم کا امتیازی سلوک جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔

مساوات کا یہ مطلب بھی ہے کہ سماج کا ہر فرد قانون کی نظر میں یکساں ہے، ان میں کسی طرح کی تفریق ممنوع ہے اور ہر شخص کو مذہب اور رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ ہندوستان کے پہلے مدبر، سیاست داں اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنی متعدد تقریروں اور کتابوں میں جمہوریت پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

> ''آج دنیا کے مختلف ملکوں میں خواہ حکومت کی کوئی شکل وصورت (Form) ہو، اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ سماجی مساوات ایک ایسا مثالی نمونہ ہے جس کو مطمح نظر بنانا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن سماجی مساوات کا مطلب مطلق مساوات نہیں بلکہ اس سے مراد یکساں مواقع ہیں۔ یہ جمہوریت کا ایک لازمی حصہ ہے''۔(۵)

یکساں مواقع (Equal opportunities) کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو لازماً یکساں ترقی کرنا چاہیے۔ ہر شخص کی ترقی کی سطح اس کی ذاتی استعداد پر منحصر ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو قدرت کی طرف سے جو صلاحیتیں ملی ہیں ان کو وہ کسی روک ٹوک کے بغیر نشو ونما دے کر حد کمال تک پہنچا سکے۔ ترقی کے مواقع صرف ان لوگوں تک محدود نہیں ہونے چاہئیں جو موروثی حیثیت یا معاشی قوت کے بل پر دوسروں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر شخص کو ایک بہتر زندگی گزارنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ سماج کا ہر فرد اپنی فطری صلاحیتوں سے ریاست کو فائدہ پہنچائے اور خود بھی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہو۔

جمہوریت اور حکومت سازی: جمہوریت میں نظری حیثیت سے عوام ہی کو حکومت کرنے کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص حکومت کرے، اس لیے جمہوریت میں یہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ عوام انتخاب کے ذریعے سے اپنے حق فرماں روائی کو ملک کی کسی ایک سیاسی جماعت کو تفویض کر دیں جو ان کی مرضی کے مطابق حکومت کا نظم ونسق چلائے۔ چنانچہ جس جماعت کو عوام کی اکثریت کی تائید وحمایت ملتی ہے اس کو حکومت کی کرسی پر بیٹھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ گویا جمہوریت میں اکثریت کی حکومت کا قاعدہ چلتا

ہے۔ جو سیاسی جماعت اقلیت میں ہوتی ہے وہ اکثریت کے حریف (حزب اختلاف) کی حیثیت سے کام کرتی ہے، یعنی اس کا کام حکومت پر تنقید کرنا اور اس کے غلط فیصلوں کے نتائج سے عوام کو آگاہ کر کے اگلے انتخاب میں اپنی جماعت کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔

جمہوریت کی خوبیاں اور خامیاں: کوئی نظام حکومت ہو اس میں جہاں خوبیاں ہوتی ہیں وہاں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں اور اس سے جمہوری حکومت بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہل علم نے جمہوریت پر تنقید کی ہے اور اس کے بعض اصولوں کو غلط بتایا ہے۔

مثلاً ارسطو نے آزادی اور مساوات کے جمہوری تصورات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علمی اور عقلی سطح پر آسانی کے ساتھ ان دونوں تصورات کی تشریح کی جاسکتی ہے لیکن تجربی سطح پر ایسا کرنا مشکل ہے۔ آزادی اور مساوات کسی سماج میں کیوں کر ممکن ہو؟ آزادی کا تصور نظم و ضبط کے تصور سے متصادم ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ایک متعین طرز حیات کی نفی کرتا ہے۔ اسی طرح مساوات کا تصور نظم بزرگان (Hierarchy)، عمدگی اور خود انصاف کے خلاف ہے۔ (۶)

تصور مساوات کی وضاحت میں ارسطو نے پیرانڈر (Perander) کی رائے جو امبریشیا (Ambracia) کا ایک ظالم (Tyrant) تھا، نقل کی ہے۔ جب تھراسائی بولس (Thrasybulus) نے پیرانڈر سے مشورتاً پوچھا کہ اس کی ریاست میں ممتاز افراد نے جو شورش برپا کر رکھی ہے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟ تو اس نے جواب میں ایک لفظ نہیں کہا بلکہ اس کے سامنے میدان میں غلے کی جو فصل کھڑی تھی اس کے ان خوشوں کے سر اس نے کاٹ لیے جو دوسرے خوشوں سے نمایاں تھے۔ اس سے تھراسائی بولس نے یہ سمجھا کہ اسے اپنی ریاست کے ممتاز افراد کے سر کاٹ لینے چاہئیں۔ (۷)

ارسطو اصولی حیثیت سے آزادی کا حامی تھا لیکن مطلق آزادی کے تصور کا مخالف تھا۔ اس کے نزدیک ایک جمہوری سماج میں آزادی کا مطلب قانون کے اندر آزادی (Freedom within the law) کا نام ہے۔ (۸)

جواہر لال نہرو اپنے عہد کی جمہوری حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فی الحال جمہوریت کی جو شکل و صورت ہے وہ کچھ زیادہ خوش آیند

نہیں ہے ۔سوال ایشیاء اور افریقہ کا نہیں ہے ۔ایشیاء اور افریقہ کے باہر دوسرے ملکوں میں بھی حالت اچھی نہیں ہے، درجوں اور شکلوں کا فرق ہوسکتا ہے۔ایسا کیوں ہے؟ فطری طور پر ہر شخص کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طریقے ہی میں کوئی خرابی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہے، دوسرے لفظوں میں مقتضیات زمانہ کا ساتھ نہ دے پا رہی ہو''۔(۹)

آزادی کے تصور کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اس میں سیاسی آزادی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور معاشی آزادی سے بڑی حد تک صرف نظر کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے سماج کا ایک بڑا طبقہ سیاسی آزادی کے باوجود ترقی اور خاش حالی سے محروم رہتا ہے۔آمریت کی طرح جمہوریت میں بھی دولت ملک کے معدودے چند افراد یا خاندانوں میں محدود رہتی ہے اور یہی لوگ پس پردہ حکومت پر اثر انداز ہوکر اس کی معاشی پالیسی کو اپنے حق میں وضع کرانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جولوگ پہلے سے امیر ہوتے ہیں وہ اور زیادہ امیر ہوجاتے ہیں اور غریب طبقہ کی غربت میں ان کی ترقی کی بہ نسبت اضافہ ہوجاتا ہے۔اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے جواہر لال نہرو فرماتے ہیں:

''لفظ جمہوریت کے بارے میں گفتگو کرنا کچھ اچھا نہیں ہے، یا کسی خاص طرز حکومت (Form of governance) کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ سب سے اچھا، نا قابل تغیر اور تنقید سے بالاتر ہے، کچھ مفید نہیں ہے۔دراصل ہمیں اساس کو لینا چاہیے۔اس کی بنیاد دراصل افراد اور جماعت دونوں کی ترقی ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ افراد کو زیادہ اہمیت دینا چاہیے، کیوں کہ اسی طریقے سے جماعت خوش حال ہوسکتی ہے۔کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جماعت (مراد ریاست) خوش حال ہوگی تو افراد بھی خوش حال ہوں گے۔

بہر حال کوئی بھی طرز حکومت ہو، اصل چیز جو مقصود ہے وہ لوگوں کی فلاح و بہبود ہے اور اس فلاح میں پہلی چیز مادی فلاح ہے، یعنی بھوک اور افلاس

سے آزادی ۔ اس لیے کہ جب تک کوئی شخص معاشی دباؤ سے آزاد نہیں ہو جاتا اس سے آگے بڑھنے کی توقع کرنا فضول ہے“۔(۱۰)

سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی آزادی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ مزید فرماتے ہیں:

”معاشی دباؤ کے تحت سیاسی آزادی ایک بہت محدود آزادی ہے۔ اس لیے کہ انسان اسی وقت ترقی کر سکتا ہے اور اس کی فطری صلاحیتیں نشو ونما پاسکتی ہیں جب کہ وہ معاشی اور دوسرے طرح کے دباؤ سے بالکل آزاد ہو جائے ۔ انسان کی تخلیقی صلاحیت غربت و فاقہ کی حالت میں کیوں کر ترقی کر سکتی ہے، خواہ اس کو ووٹ کا حق حاصل ہو۔

اس صورت حال کے پیش نظر بعض لوگ سیاسی آزادی سے زیادہ معاشی فلاح پر زور دیتے ہیں، (۱۱) خواہ اس کے عوض سیاسی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے ۔ اس حل سے دوسری مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں ۔ اگر آپ لوگ فی الواقع چاہتے ہیں کہ لوگ ترقی کریں اور انہیں ترقی کے مواقع حاصل ہوں تو اس کے لیے معاشی آزادی کے ساتھ سیاسی آزادی بھی ضروری ہے“۔(۱۲)

جمہوریت میں اظہار رائے کی آزادی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

”جمہوری طرز زندگی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر شخص کو غور و فکر اور بحث و مناقشہ کی آزادی حاصل ہے، وہ جس خیال کو صحیح سمجھتا ہے اس کو کسی خوف اور اندیشے کے بغیر ظاہر کر سکتا ہے۔ مخالف رائے کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے اظہار کے مواقع ہر شخص کو حاصل ہوتے ہیں ۔ اس طرح صحیح نقطۂ نظر کو غلبہ حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو لیکن اگر وہ خیال صحیح ہے تو آخر کار ضرور غالب ہو کر رہے گا“۔(۱۳)

بلاشبہ اظہار رائے کی آزادی جمہوریت کی ایک بڑی خوبی ہے۔ لیکن اگر یہ آزادی قانون کے دائرے میں نہ ہو تو وہ بسا اوقات فتنہ و فساد کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ہندوستان

میں ہندو فرقہ پرست جماعتوں کی طرف سے اس ملک کی اقلیتوں کے ساتھ جو نازیبا سلوک کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف ہر طرح کی زہر افشانی کی جاتی ہے وہ آزادی کے غلط استعمال کی ایک واضح مثال ہے۔

اس معاملے میں مغربی ممالک کا رویہ بھی غیر جمہوری ہے، حالانکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جمہوریت کے سب سے بڑے علم بردار ہیں اور اظہار رائے کی آزادی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن وہ دوسروں بالخصوص مسلمانوں کے معاملے میں اکثر اس آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان کے خاص و عام سب اسلام اور اس کے پیغمبر پر اس حد تک جارحانہ تنقید کرتے ہیں کہ وہ بسا اوقات تہذیب و شائستگی کی حدوں سے تجاوز کر کے تذلیل و اہانت کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔ جب مسلمان ان کی ناشائستہ حرکات پر احتجاج کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ اظہار رائے کی آزادی کے قائل ہیں۔ برطانوی قانون میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تنقید ممنوع ہے لیکن اسلام کے پیغمبر پر تنقید ہی نہیں ان کی تذلیل کی ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟

مغرب کا یہ منافقانہ رویہ اس وقت بالکل کھل جاتا ہے جب کوئی شخص ہولوکاسٹ پر تنقید کرتا ہے اور اس کی تاریخی حیثیت کو معرض بحث میں لے آتا ہے۔ ایسے شخص کو نہ صرف مطعون کیا جاتا ہے بلکہ بعض مغربی ملکوں میں اس تنقید کی سزا قید و بند ہے۔ یہ کیسی اظہار رائے کی آزادی ہے؟ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ہولوکاسٹ جس میں کہا جاتا ہے کہ ۶۰ لاکھ یہودیوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا، کوئی مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور ابھی ثبوت کا محتاج ہے۔ خیال و عمل میں یہ فرق اس بات کا ثبوت ہے کہ مغرب اپنی تمام روشن خیالی اور وسیع المشربی کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی اور متعصّبانہ اور غیر جمہوری رویہ رکھتا ہے۔

جمہوریت کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس میں سارے لوگ خواہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ، انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں اور اس کے نتیجے میں نااہل افراد بھی محض عیاری یا سرمائے کے بل پر منتخب ہو جاتے ہیں۔ برطانوی فلسفی جان اسٹوارٹ مل (م ۱۸۷۳) جو نمائندہ جمہوریت (Representative democracy) کا زبردست حامی تھا، لکھتا ہے:

''جمہوریت بلاشبہ ضروری اور لازمی چیز ہے لیکن یہ اپنے اندر کچھ برائیاں بھی رکھتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں اکثریت بالعموم معمولی صلاحیت کے حامل افراد کو حکمرانی کے لیے منتخب کرتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آزادی ، اصلیت (Originality) اور لامرکزیت (Decentralization) کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے''۔ (۱۴)

جمہوریت کے بعض دوسرے عملی نقائص بھی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

جمہوریت کے ان نقائص کے باوجود جن کا اوپر ذکر ہوا، تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ آمریت کے مقابلے میں بہتر طرز حکومت ہے۔ آمریت میں انسان کے فطری حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں اور چند لوگ حاکم اور انسانوں کی کثیر تعداد ان کی محکوم ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں ان پر حکومت کرتے ہیں، حتی کہ ظلم وستم سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جمہوریت میں نہ صرف انسان کے فطری حقوق کا لحاظ کیا جاتا ہے بلکہ وہ آمروں کے ظلم وستم سے بھی محفوظ ہو جاتے ہیں، کیوں کہ زمام حکومت عام لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ سب سے بڑی نعمت ضمیر اور عقیدہ ومسلک کی آزادی ہے۔ اظہار رائے کی آزادی کو اگر قانون کی حد کے اندر رکھا جائے تو یہ بھی جمہوری طرز حکومت کی ایک بڑی خوبی ہے جو کسی اور دنیوی نظام میں موجود نہیں ہے۔ سوامی ناتھن لکھتے ہیں:

"Why, despite all this, do we regard democracy as the best political system? Because it is grounded in choice for the ordinary man, and freedom to chooze is a permanent virtue that makes other freedoms possible. In democracies, the ruler is choozen by ordinary citizens and voted out by them too." (۱۵)

''ان سب (نقائص) کے باوجود ہم کیوں جمہوریت کو ایک عمدہ سیاسی نظام خیال کرتے ہیں؟ اس لیے کہ اس کی بنیاد عام لوگوں کی پسند پر قائم ہے اور انتخاب کی آزادی ایک ایسی دائمی خوبی ہے جو دوسری آزادیوں کے

حصول کو ممکن بناتی ہے۔ جمہوریت میں عوام اپنے فرماں روا کا انتخاب کرتے ہیں اور وہی ان کو کرسی اقتدار سے ہٹا دیتے ہیں''۔

اس معاملے میں سابق برطانوی وزیر اعظم چرچل کی رائے زیادہ صائب ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جمہوریت کوئی مثالی نظام (Ideal system) نہیں ہے لیکن دوسرے سیاسی نظامات اس سے زیادہ برے ہیں۔ (۱۶)

کیا جمہوریت اور اسلام میں مطابقت ہے؟: جمہوریت میں حکومت سازی کے عمل میں عوام کی شرکت اور اس معاملے میں ان کی فیصلہ کن حیثیت، نیز سماجی مساوات اور سیاسی و معاشی آزادی کے تصورات کی خوبیوں کو دیکھ کر بہت سے مسلم اصحاب علم کا خیال ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں مطابقت پائی جاتی ہے اور وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس کو اختیار کرنے میں مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہمارے بعض علماء نے کچھ زیادہ ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ علامہ رشید رضا مصری نے خلافت راشدہ کو جمہوریت ہی کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ (۱۷)

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی معروف کتاب ''الفاروق'' میں کئی مقامات پر جمہوریت اور سوشلزم کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں کوئی مغایرت نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''حضرت عمرؓ نے خلافت کے متعلق جو تقریر کی تھی وہ درحقیقت حکومت جمہوری کی اصلی تصویر ہے اور حکومت جمہوری کی حقیقت آج بھی اس سے واضح تر و صحیح تر نہیں بیان کی جا سکتی''۔ (۱۸)

اس معاملے میں بعض مسلم دانشوروں نے غلو کی حد تک جمہوریت اور اسلام میں مطابقت کا دعویٰ کیا ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں:

> ''حیرت ہے کہ لوگ اس طرح کی جمہوریت رکھنے والے اسلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسلام کا جمہوریت سے کوئی تعلق نہیں حالانکہ جمہوریت کے خلاف بولنا دراصل اسلام کے خلاف بولنا ہے، جمہوریت کے

خلاف بولنا اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بولنا ہے''۔(۱۹)

لیکن کئی معروف مسلم دانشور اور علماء جمہوریت کے ناقد ہیں اور بعض جزوی مشابہتوں کے باوجود اسلام اور جمہوریت میں کوئی مطابقت نہیں دیکھتے بلکہ کہتے ہیں کہ بعض معاملات میں جمہوریت اسلام سے صریحاً متصادم ہے۔

علامہ اقبال جمہوریت کے شدید مخالف تھے۔انہوں نے اپنی نظم ونثر دونوں میں اس تصور حکومت کی نفی کی ہے۔ان کی مشہور نظم ''خضر راہ'' کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام	جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب	تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق	طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس ، الاماں	یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو	آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو (۲۰)

اقبال کا خیال ہے کہ جمہوریت دراصل سرمایہ داروں کے ذہن کی پیداوار ہے تاکہ وہ انفرادی آزادی کے جمہوری تصور کے پردے میں کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی تجارت کو فروغ دیں اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کر کے خوب عیش کرے۔

اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ جمہوریت ملوکیت ہی کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔اس کا ظاہر بلاشبہہ حسین اور جاذب نظر ہے لیکن اس کا باطن تاریک اور بڑا ہی خوف ناک ہے۔ان کی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟	تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

پہلا مشیر

ہوں ، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے	جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس	جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر
کاروبارِ شہر یاری کی حقیقت اور ہے	یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن ، اندرون چنگیز سے تاریک تر (۲۱)

اقبال جمہوریت کو احمقوں کی حکومت سمجھتے تھے کیونکہ اس میں ایک جاہل اور عالم دونوں انتخاب حکومت میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں ، تولا نہیں کرتے (۲۲)
گریز از طرزِ جمہوری ، غلام پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانی نمی آید

معلوم ہے کہ جمہوریت میں مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے، ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اقبال کے نزدیک ریاست اور مذہب میں جدائی ممکن نہیں، کیونکہ مذہب کی رو سے خدا ہی حاکم اعلیٰ ہے اور بندوں کو اسی کے قانون کی اطاعت کرنی ہے، جب کہ جمہوریت میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس میں خدا کے بجائے عوام ہی حاکم اور قانون ساز ہوتے ہیں۔ اقبال ہر اس سیاسی نظام کو جس میں مذہب کو قیادت کا مقام حاصل نہ ہو، چنگیزی حکومت قرار دیتے ہیں ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (۲۳)

اقبال نے اپنے بعض مضامین میں بھی جمہوریت کے بارے میں اپنے ذہنی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ معروف مغربی دانشور ینگ ہسبینڈ کے ایک مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ''جمہوریت کے ساتھ جھگڑے اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ جمہوریت کامل سیاسی سکون کی ضامن ہے تو وہ دنیا کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جمہوریت میں ایسی تمام خواہشات اور شکایات کو پھر سے ابھرنے کا موقع ملتا ہے جنہیں شخصی حکومت کے دور میں دبا دیا گیا ہو یا پورا نہ کیا گیا ہو۔ جمہوریت ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کی موجد ہوتی ہے جو بسا اوقات نا قابلِ عمل ہوتی ہیں''۔ (۲۴)

ہندوستان کے معروف عالم اور مفسر قرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ اشترا کیت (۲۵) اور جمہوریت دونوں کے منکر تھے۔ وہ جمہوریت کے متعلق لکھتے ہیں:

''فوضی (ایسی حکومت جس میں سب کی حیثیت مساوی ہو) عربوں

کے نزدیک ایک ناپسندیدہ طریقۂ حکومت تھا اور اسے وہ احمقوں کی حکومت قرار دیتے تھے لیکن اس وقت مغرب میں بہت سے لوگ اس طرزِ حکومت کے داعی و مبلغ ہیں اور اس سے عوام کو گمراہ کرتے ہیں، مگر یہ طریقہ بھی پہلے طرز حکومت کی طرح فتنہ اور نظام انسانی کی شکست و ریخت کا ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء: ۵۹) ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحب امر ہوں ان کی بھی''۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ: ۳۸) ''اور ان کے معاملات باہم مشورہ سے انجام پاتے ہیں''۔(۲۶)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا بھی خیال تھا کہ جمہوریت اسلام کے بالکل برخلاف تصور حکومت ہے۔ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''تاریکی اور روشنی میں، رات اور دن میں، بدی اور نیکی میں جو فرق ہے وہی جمہوریت اور اسلام میں ہے۔ آپ فلسفہ کی رو سے بھی غور کرلیں۔ آپ جمہوریت کی تعریف کریں۔ عوام کی حکومت، عوام کے لیے، عوام کے ذریعہ سے، عوام کی بہبود کے لیے، یہی تعریف ہے آپ کسی جگہ پڑھ لیجیے۔ اسلام میں اللہ کی حاکمیت، اللہ کی حکومت، اللہ کے قانون کے ذریعہ سے، اللہ کے ماننے والوں کے لیے، موٹی سی یہ تعریف ہے، کہیں پڑھ لیں۔ اب ان دونوں میں ذرا جوڑ ملائیے۔ ہے کوئی جوڑ ملتا ہوا، کوئی تک ہے۔

جمہوریت کی نمائش کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں اور امریکنوں نے ایک نظام چلا کر ساری دنیا کو مبہوت کردیا ہے، لیکن حالت کیا ہے۔ آپ یقین کریں کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بڑی بڑی لابیاں ہوتی ہیں اور ان کے ہاتھ میں تمام پبلسٹی کے ذرائع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ماہران کے ملازم ہوتے ہیں اور وہ جس شیطنت کو پھیلانا چاہیں پھیلا دیتے ہیں۔ اس جمہوریت کے متعلق گزشتہ جنگ عظیم کے فاتح چرچل اور ڈیگال وغیرہ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ جمہوریت نازک حالات میں نہیں چل سکتی۔ اس زمانے میں صرف آمر ہی حکومت

کرسکتا ہے، ان کا یہ فیصلہ تھا کہ یہ سب چیزیں ایک سراب ہیں۔

اسلام کا اپنا الگ نظام ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی بنیاد بہر حال ایک نظام پر ہوگی لیکن اس کی شکل ایمانی ہوگی، اس کی بنیاد علم وتقویٰ پر، اہل استنباط پر اور شورائیت پر ہوگی۔ خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام اہم معاملات میں اہل استنباط سے مشورہ کرے اور وہ قوم کے معتمد لوگ ہوں گے جو کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلہ کریں گے۔ اس کے لیے آج کے زمانے میں بھی ایک نظام بنایا جاسکتا ہے اور پہلے بھی تھا۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رہا ہے۔ اس کے بعد کے زمانے میں بعض خصوصیات مٹ گئیں، لیکن بہت سی خصوصیات باقی رہی ہیں۔ بنوامیہ کے زمانے میں بہت سی خصوصیات رہیں۔ قانون کا مرجع کتاب وسنت تھا اور اس میں اشخاص کی مرضی کو بالکل دخل نہیں تھا۔ اس زمانے میں حنفیت، شافعیت اور مالکیت کے جھگڑے تو نہیں تھے، کتاب وسنت تھی۔

یہ بات بھی صحیح ہے کہ اسلام کو بادشاہ سے کوئی کد نہیں۔ بادشاہ کو عادل ہونا چاہیے، شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔ خلیفہ ہے تو وہ اللہ کے قانون کو، شریعت کو جاری کرنے والا ہو اور شوریٰ کا پابند ہو۔ شوریٰ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے قانون تابع ہو اور اجتہاد پر مبنی ہو۔ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ اہل علم، اہل استنباط اور اہل الرائے اس کے ممبر ہوں''۔ (۲۷)

راقم کا خیال ہے کہ جمہوریت کے بارے میں اول الذکر گروہ غلطی پر ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت بطور ایک سیاسی نظام کے عین اسلام ہے وہ جمہوریت کے فلسفہ اور اس کی تاریخ سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ جمہوریت میں آمریت کے برخلاف حکمراں کا انتخاب ہوتا ہے اور اس میں خاص وعام سب شریک ہوتے ہیں اور ہر شخص کو آزادیِ فکر وعمل حاصل ہے، گمان کرلیا کہ یہ عین اسلامی طرز حکومت ہے۔

لیکن یہ محض جزئی مشابہت ہے۔ یہ اسی طرح کی مشابہت ہے جو اسلام کے نظریۂ معیشت اور سوشلزم میں ہے کہ دونوں ہی نظام ارتکاز زر کے خلاف ہیں۔ اس جزئی مشابہت کو دیکھ کر بعض اہل علم نے خیال کیا کہ اسلام سوشلزم کا حامی ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کرلی۔ جس طرح یہ بات غلط ہے، اسی طرح پہلی بات بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ایک اپنا منفرد سیاسی نظام ہے جو مشاورت کے اصول پر مبنی ہے۔(۲۸) یہ شورائی نظام تمام مادی نظامات سے بالکل الگ ہے۔وہ ایک خدا پرستانہ نظام ہے جس میں خدا کی حاکمیت کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں مادہ اور روح دونوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں ریاست کے امور عقل اور وحی دونوں کی رہنمائی میں انجام دیے جاتے ہیں، جب کہ جمہوریت کے سیاسی فلسفہ میں روحانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، وہ ایک خالص مادہ پرستانہ سیاسی نظام ہے اور اس میں عوام ہی حاکم اور قانون ساز ہوتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

جمہوریت کا جائزہ اسلامی نقطۂ نظر سے: یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ دوسرے عصری مادی اور سیاسی نظاموں کے مقابلے میں جمہوریت اپنے متعدد نقائص کے باوجود قابلِ ترجیح اور اہل دنیا کے لیے ایک مفید سیاسی نظام ہے۔لیکن اہل اسلام کے لیے جمہوریت میں کشش کا کوئی سامان نہیں ہے اور کیوں کر اس طرف ان کا میلان ہوسکتا ہے کہ وہ مادی طرز فکر کی ترجمان ہے۔یہ اس لیے بھی قابل ترجیح نہیں ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام ہر پہلو سے جمہوریت سے فائق ہے۔یہاں جمہوریت کے عناصر ترکیبی کا جائزہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے لیا جائے گا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جمہوریت اور اسلام کے بعض اصولوں میں جو مشابہت نظر آتی ہے وہ بالکل ظاہری مشابہت ہے، فی الواقع ان میں مغایرت ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو کہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں میں جو نقائص ہیں اور ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، ان سے اسلام کا سیاسی نظام پاک ہے۔

حاکمیت عوام: اسلامی نقطۂ نظر سے جمہوریت کی سب سے بڑی نظری خامی اس کا تصور حاکمیت ہے، یعنی یہ خیال کہ عوام ہی اصل فرماں روا، حاکم اور قانون ساز ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام میں حاکمیت عوام کے بجائے حاکمیت الٰہ کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں کسی انسان کو خواہ اس کا تعلق طبقۂ عوام سے ہو یا خواص سے، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حاکم بن کر دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔اس میں عوام تو کجا، علماء و مشائخ کو بھی ''ارباب من دون اللہ'' بننے کا حق نہیں دیا گیا ہے۔حکومت کرنے کا حق صرف اس خدائے ذو الجلال کو حاصل ہے جو انسانوں کا خالق و مالک اور ان کا پروردگار ہے۔وہی اصلی حاکم ہے اور

بقیہ سارے انسان اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

جن لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی نظام کی باگ ڈور ہوتی ہے ان کی حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ اصلی حاکم کی طرف سے بندوں کے اجتماعی معاملات کے نگراں اور منتظم کی ہے۔ ان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ خود حاکم کائنات کی مرضی کے مطابق چلیں اور بندگانِ خدا کو بھی اس کے احکام و قوانین کے مطابق جو اس کی آخری کتاب میں دیے گئے ہیں، چلائیں اور عدل و انصاف کے ساتھ ان کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔ اسلام میں حکومت ایک امانت ہے اس لیے اس کا حق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جو امین ہوں۔

انسان کی فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کرے، خواہ یہ غلامی استبدادِ شخصی کی صورت میں ہو یا جمہوریت کے خوش نما لباس میں۔ اسلام کے سیاسی نظام کے سوا کوئی دنیوی نظام ایسا نہیں ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دے سکے۔

انفرادی آزادی: جمہوریت کی طرح اسلامی حکومت میں بھی انفرادی آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے، لیکن اس کا مطلب مطلق آزادی نہیں، جیسا کہ جمہوریت میں خیال جاتا ہے۔ مطلق آزادی کا مطلب فکری اور عملی انارکی ہے اور اس سے معاشرے میں فتنہ وفساد پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ ایشیاء اور افریقہ کے جمہوری ملکوں میں اس بے قید آزادی کے اندوہ ناک مظاہر اکثر و بیشتر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہندوستان میں دلی اور ملک کے دوسرے حصوں میں سکھوں کے ساتھ ہونے والا انسانیت سوز سلوک، گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام اور ابھی حال میں اڑیسہ میں عیسائیوں کی جان و مال کی بربادی اسی بے قید آزادی کے مہلک نتائج ہیں۔

اسلامی نظام میں کسی شخص یا گروہ کو اس نوع کی مطلق آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں آزادی کا مفہوم اور اس کے حدود بالکل واضح ہیں۔ آزادی کا مطلب قوانین کے دائرہ میں رہ کر عمل کی آزادی ہے۔ قانون کی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہی یہ آزادی مسلوب ہو جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں ہر شخص کو خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، مذہب و عقیدہ، تنظیم و اجتماع بشرطیکہ اچھے کاموں کے لیے ہو، نہ کہ شر وفساد پھیلانے کے لیے اور کسب معاش کی پوری آزادی اور یکساں مواقع حاصل ہیں۔ متانت اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر اظہار خیال اور

اختلاف رائے کا حق بھی سب کو حاصل ہے۔ اس میں مالک اور نوکر اور مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

عہد نبوی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت کو جب اس کے شوہر نے مارا تو اس نے کھلے عام نبی ﷺ کے پاس جا کر اپنے شوہر کی شکایت کی (سورۂ مجادلہ:۱)۔ ایک بار کسی بات پر حضرت عمرؓ کی بیوی نے ان کو پلٹ کر جواب دیا تو انہوں نے کہا، اب تمہارا یہ رتبہ ہوگیا، وہ بولیں کہ تمہاری بیٹی تو رسول اللہ ﷺ سے دو بدو ایسی باتیں کرتی ہے۔ (۲۹)

یہ اظہار رائے کی آزادی ہی تھی کہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا اسمعوا و اطیعوا ''سنو اور مانو'' تو ایک شخص نے بے باکی کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا نہیں، پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ جو لباس پہنے ہوئے ہیں وہ کیسے بنا؟ جب خلیفہ کے فرزند عبداللہ بن عمرؓ نے ان کی طرف سے تسلی بخش جواب دے دیا تو اس نے کہا، ہاں اب کہو، ہم سنیں گے اور مانیں گے۔ (۳۰) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمرؓ تقریر کر رہے تھے کہ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور بولا اتق اللہ یا عمر ''اے عمر خدا سے ڈرو''۔ حاضرین مجلس کو یہ بات گراں گزری اور ان میں سے ایک شخص نے اس کو خاموش کرنے کی کوشش کی تو خلیفہ نے کہا، اس کو کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں تو ان کا کیا فائدہ اور ہم ان کی نہ سنیں تو ہماری کیا ضرورت۔ (۳۱)

مساوات: جمہوریت میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، سب لوگ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، گورے ہوں یا کالے، پیدائش کے اعتبار سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب، جنس اور رنگ و نسل کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی قابلیت اور سعی و جہد سے حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قانون کی نظر میں ہر آدمی مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن مساوات کے یہ سارے جمہوری دعوے محض کاغذ کی زینت ہیں، عمل کی دنیا میں ان میں سے ایک دعویٰ بھی آج تک حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکا ہے۔ یہ بات مشاہدہ میں ہے کہ بیشتر جمہوری ملکوں میں سماج کے کمزور طبقات اور اقلیتوں کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ چوں کہ جمہوریت میں اکثریت کی حکومت کا قاعدہ چلتا ہے اس لیے جو طبقہ تعداد میں زیادہ

ہوتا ہے وہ سماج کے ان طبقات کے ساتھ جو تعداد میں کم ہوتے ہیں، ناروا سلوک کرتا ہے، ان کو خود سے حقیر اور کم تر سمجھ کر ان کے خلاف ہر طرح کی زیادتی کو جائز سمجھتا ہے۔ ان کی جان و مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں۔ اتنا ہی نہیں اقلیت کی زبان کو مٹانے، ان کی تہذیبی اقدار کی بیخ کنی کرنے، ان کے ملی تشخص اور تہذیبی امتیازات کو اکثریت کے تہذیبی دھارے میں ضم کرنے کو وہ اپنا قومی اور ملکی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں دلتوں اور مسلمانوں اور امریکہ میں کالوں کے ساتھ ہونے والا امتیازی سلوک جمہوریت کی نظری مساوات کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔

اسلام کا تصور مساوات اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ وہ ایک متوازن تصور مساوات ہے، جس میں منافقت کا ادنیٰ شائبہ شامل نہیں ہے۔ اس تصور مساوات میں اس بات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ سارے انسان باعتبار پیدائش مساوی ہیں۔ فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً الخ (نسآء:۱)	اے لوگو! اپنے اس رب کی نافرمانی سے بچو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور پھر دونوں (کے اتصال) سے بہت سے مرد اور عورت (بنا کر روئے زمین پر) پھیلا دیے۔

ظاہر ہے کہ جب تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو پھر ان کے درمیان رنگ و نسل اور زبان اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز کرنے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ رنگ و نسل اور زبان کا اختلاف فروعی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ ان کا تعلق پیدائش سے نہیں بلکہ جغرافیائی حالات سے ہے۔ اسلام میں ہر شخص خواہ وہ سیاہ فام یا سفید فام، عورت ہو یا مرد، عجمی ہو یا عربی، مالک ہو یا نوکر، یکساں عزت واحترام کا مستحق ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

"اے لوگو! تم سب کا رب ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری نہیں ہے مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت

والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہو"۔ (۳۲)

اسی طرح حقوق اور سماجی حیثیت کے معاملے میں جنس کی بنیاد پر کوئی تفریق و امتیاز روا نہیں ہے۔ فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ: ۲۲۸)	ان کے (یعنی عورتوں کے) لیے وہی حقوق ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

لَآ اُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُم مِّنْ بَعْضٍ (آل عمران: ۱۹۵)	میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کروں گا، تم سب آپس میں ایک ہو (یعنی ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہو)۔

کنیزوں سے نکاح کے ذکر میں فرمایا:

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُم مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُم مِّنْ بَعْضٍ (نسآء: ۲۵)	اور تم میں سے جس کو یہ مقدرت حاصل نہ ہو کہ وہ آزاد مومنہ عورت سے نکاح کر سکے تو وہ ان مومنہ لونڈیوں سے جو تم لوگوں کی مملوکہ ہوں، نکاح کر لے، اللہ کو تمہارے ایمان کی خوب خبر ہے، تم سب آپس میں ایک ہو۔

انسانی مساوات کی یہ اعلیٰ تعلیم محض کوئی نظری معاملہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا وہ مساوات کی مذکورہ بالا تعلیم پر مبنی تھا۔ اس میں پیدائشی اعتبار سے کوئی پست و بلند نہیں تھا۔ امیر و غریب اور آقا و غلام سب آپس میں بھائی تھے۔ سب کو دنیوی اور دینی ترقی کے یکساں مواقع حاصل تھے۔

نبی ﷺ کی وفات کے بعد جو لشکر شام کی طرف بھیجا گیا اس کے کمانڈر ایک نوعمر صحابی اسامہ بن زیدؓ تھے، یعنی آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام زید بن ثابتؓ کے فرزند، جن کو نبی ﷺ نے

اپنا متبنّٰی بنالیا تھا۔اس لشکر کی روانگی کا حال ایک اسلامی مورخ کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''حضرت اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور جانشینِ رسول (خلیفہ) پیادہ پا گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ لگام تھامے ہوئے تھے۔ اسامہؓ نے کہا، اے جانشینِ رسول! آپ بھی سوار ہولیں، ورنہ مجھے اترنے کی اجازت دیں۔ فرمایا، نہ میں خود سوار ہوں گا اور نہ تم کو اترنے کی اجازت دوں گا۔ یہ تعلیم اس بنا پر تھی کہ کوئی نوعمروں اور غلام زادوں کو حقیر نہ سمجھے''۔(۳۳)

حضرت عمرؓ کے سفر شام کا حال بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانیؒ نے لکھا ہے کہ ''حضرت علیؓ کو مدینہ کی خلافت دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے۔ یُر فاان کا غلام اور بہت سے صحابہ ساتھ تھے۔ ایلہ کے قریب پہنچے تو کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی اور خود اس کے اونٹ پر سوار ہوئے۔ راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے، پوچھتے تھے کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرماتے کہ ''تمہارے آگے''۔(۳۴)

مساوات کی اسلامی تعلیم پر اس وقت بھی عمل کیا گیا جب اسلامی معاشرے میں بہت سی خرابیاں آگئی تھیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ عہد عباسی کے نامور خلفاء مامون الرشید (۸۱۳ء-۸۳۳ء) اور معتصم (۸۳۳ء-۸۴۲ء) لونڈیوں کے بطن سے تھے۔(۳۵) مصروشام میں ۱۲۵۰ء سے ۱۳۸۲ء تک جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ غلام یعنی مملوک تھے۔(۳۶)

ہندوستان میں پہلی اسلامی حکومت قائم کرنے والا قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء-۱۲۱۰ء) سلطان شہاب الدین غوری (۱۲۰۲ء-۱۲۰۶ء) کا غلام تھا۔ قطب الدین کے بعد جو لوگ تختِ حکومت پر بیٹھے وہ سب غلام تھے۔ یہ دور جو تقریباً ایک سو سال پر محیط ہے، تاریخ میں عہد غلاماں (Slave Period) کے نام سے مشہور ہے۔

اسلام کے تصور مساوات میں تیسری چیز جو نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ قانونی مساوات ہے، یعنی سارے لوگ خواہ ان کا تعلق سماج کے کسی طبقہ سے ہو، قانون کی نظر میں مساوی ہیں۔ اور اس کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بہ کثرت ہیں۔ ایک بار قبیلۂ قریش کی ایک عورت فاطمہ بنت

قیس نے چوری کی تو مسلمانوں نے اسامہ بن زیدؓ کے توسط سے نبی ﷺ سے سفارش کرائی کہ عورت کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔آپ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی
سرقت فاطمة بنت محمد	جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد نے چوری کی
لقطعت یدھا (۳۷)	ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

خلیفۂ دوم کے عہد کا واقعہ ہے کہ مصر کے گورنر عمرو بن العاصؓ کے صاحب زادے محمد بن عمروؓ نے ایک قبطی مصری کو محض اس بنا پر تازیانے مارے کہ گھوڑ دوڑ میں اس کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا۔خلیفہ کو جب اس زیادتی کی خبر ملی تو باپ اور بیٹے دونوں کو مدینہ طلب کیا اور مصری کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا ''مار شریفوں (۳۸) کے بیٹے کو''۔صاحب زادے کی پٹائی کے بعد فرمایا ''عمرو بن العاص کی چندیاں پر بھی درّے لگا، کیونکہ خدا کی قسم اس نے اس کی حکومت ہی کے بل پر تجھے مارا ہے''۔مگر مصری نے کہا کہ ''امیر المومنین، جس نے مجھے مارا تھا میں نے اس سے بدلہ لے لیا اور میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا''۔(۳۹) اس موقع پر خلیفہ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

منذ کم تعبدتم الناس وقد	تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا ہے
ولدتھم امھاتھم احرارا (۴۰)	حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

حضرت عمرؓ ہی کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ جبلہ بن اَیہم غسانی نے ایک بدو کو تھپڑ مار دیا۔اس نے بھی ایسا ہی کیا اور معاملہ خلیفہ تک پہنچا۔انہوں نے بدو کے بدلے کو درست قرار دیا۔اس فیصلے پر غسانی نے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا ''امیر المومنین، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی ہے اور میں اپنے علاقے کا بادشاہ ہوں''۔خلیفہ نے فرمایا ''اسلام نے دونوں کو بھائی بنا دیا ہے، اب تم صرف تقویٰ کے ذریعہ سے اس پر فضیلت حاصل کر سکتے ہو، کسی اور صورت میں نہیں''۔(۴۱)

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''کنز العمال'' کے حوالے سے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس بلکہ بادشاہ تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔کعبے کے طواف میں اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک شخص کے پاؤں

کے نیچے آ گیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ غصے سے بے تاب ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سن کر کہا، تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی۔ اس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و ذلیل کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آتا ہوں۔ غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا''۔ (۴۲)

خود خلیفۂ دوم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن بن عمرؓ پر شراب نوشی کے جرم میں حد جاری کر کے حاکم اور رعایا کے درمیان قانونی مساوات کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ (۴۳) جمہوریت کے علم بردار قانون کی نظر میں مساوات (Equality before law) کا بہت چرچا کرتے ہیں، لیکن کیا وہ کوئی ایسا واقعہ پیش کر سکتے ہیں کہ کسی جمہوری ملک کے فرماں روا نے اہل خاندان کو ان کے کسی جرم پر خود اپنے ہاتھوں سزا دی ہو یا پیش قدمی کر کے عدالت سے سزا دلوائی ہو؟

ابھی تک جمہوریت کی نظری خامیوں سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بالمقابل اسلامی نظام حکومت کے نظری اور عملی پہلوؤں کو پیش کر کے دکھایا گیا ہے کہ اس کے اصول اور قاعدے زیادہ عمدہ اور عدل پر مبنی ہیں۔ اب آگے جمہوریت کے عملی نقائص پر گفتگو ہوگی اور اس کے بعد اسلام کے شورائی نظام کے عملی طریقوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

عملی اعتبار سے جمہوریت کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں حکومت کی تشکیل براہِ راست عوام کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جن ملکوں بالخصوص ایشیاء اور افریقہ کے عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے، ان سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ سیاسی بیداری کا ثبوت دیں گے اور ان ہی افراد کو منتخب کریں گے جو سیاسی فہم اور قانون سازی کی صلاحیت رکھتے ہوں، نادانی کی بات ہوگی اور یہ بات ان ملکوں کے جمہوری تجربوں سے بالکل واضح ہے۔

دوسرا عملی نقص یہ ہے کہ عوام انتخاب کے ذریعے اپنے جو نمایندے چنتے ہیں ان کے لیے کسی طرح کی علمی قابلیت اور سیرت کی خوبی لازمی نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ وہ بالکل ناخواندہ ہو، عوام کا نمایندہ بن سکتا ہے، حتی کہ خراب سیرت کے لوگ بھی اکثر اوقات مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہو جاتے ہیں۔

یہ طرفہ تماشا نہیں تو کیا ہے کہ حکومت کے مختلف مناصب پر تقرری کے لیے ایک خاص لیاقت ضروری ہے، اس کے بغیر کسی عہدہ پر تقرری ناممکن ہے۔ لیکن سیاست ایک ایسا شعبہ ہے جس کے لیے کوئی لیاقت مطلوب نہیں ہے، حالانکہ یہ شعبہ حکومت کے دوسرے تمام شعبوں کے لیے مثل دماغ کے ہے۔ اگر اس شعبہ میں صاحب علم افراد نہ ہوں تو حکومت کے دوسرے شعبوں کی کارکردگی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو مجلس آئین ساز کی شکل میں قوانین وضع کرتا ہے اور مجلس عاملہ کی شکل میں ان کو نافذ کرتا ہے۔ کام کی یہ نوعیت خود بتاتی ہے کہ اس شعبہ میں کس قسم کے افراد کی ضرورت ہے۔ ماہرین علم سیاست کا یہ متفقہ خیال ہے کہ کوئی جمہوری حکومت صرف اسی صورت میں کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے جب اسے دور اندیش اور بیدار مغز قیادت میسر ہو۔

جمہوریت کے مذکورہ نقص ہی کی وجہ سے افلاطون نے اپنی کتاب ریاست (Republic) میں لکھا ہے:

> ''جمہوریت محض نراج کا نام ہے، اس میں بناوٹ اور تصنع کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے شہری خود غرضی اور مکاری میں ایسے ڈوبے ہوتے ہیں کہ کوئی کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ شہریوں میں فرقہ بندیاں نمودار ہوتی ہیں اور ہر فرقہ کا کوئی ایسا مکار اور چال باز آدمی سردار بن جاتا ہے جسے اپنے اقتدار کے علاوہ کسی اور بات کی فکر نہیں ہوتی۔ آخر میں ایک وقت آتا ہے جب ان ہی فرقوں کے سرداروں میں سے ایک شہر کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھتا ہے۔ اس شخص کی ہوس اور شہرت کی بے لگامی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے، دیکھنے میں وہ دوسروں کا بادشاہ، لیکن دراصل اپنی خواہشوں کا بے بس غلام ہوتا ہے اور کوئی ایسی کمینی

اور ظالمانہ حرکت نہیں ہوتی جو اس سے سرزد نہ ہو، اس لیے کہ اس کا دل عقل کی روشنی اور اخلاق کی رہبری سے محروم ہوتا ہے''۔(۴۴)

جمہوریت کا تیسرا عملی نقص اس کا جماعتی طریقۂ انتخاب ہے۔ اس قاعدے کے مطابق وہی لوگ بحیثیت امیدوار کھڑے ہوتے ہیں جن کو کوئی سیاسی جماعت اپنا امیدوار بناتی ہے اور جماعت ان ہی لوگوں کو اپنا امیدوار بناتی ہے جو جماعت کے قاید کے فرماں بردار ہوتے ہیں یا کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مفادات کی یہ جماعت نگراں اور محافظ ہوتی ہے۔ اس طرح ہر سیاسی جماعت ملک وقوم کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کے بجائے جماعتی یا شخصی مفادات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملکی سیاست میں جماعتی اور شخصی مفادات کو غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہے کہ سماج کے وہ افراد جو علم و تجربہ اور کردار کی خوبیاں تو رکھتے ہیں لیکن سرمایہ کی قلت اور کسی سیاسی جماعت یا بڑی سیاسی شخصیت سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکی سیاست سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔ اس طرح ملک باصلاحیت اور صاحب کردار افراد سے محروم ہوجاتا ہے اور ملک کی زمام اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جو نااہل ہی نہیں ہوتے بلکہ پرلے درجے کے خودغرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ اور بالآخر ایسے بدقماش لوگوں کے ہاتھوں ملک تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔

جمہوریت کا چوتھا عملی نقص یہ ہے کہ اس میں انتخاب کا عمل مسرفانہ ہے۔ اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ ملک کی دولت ضائع ہوتی ہے اور دوسرا نقصان جو زیادہ بڑا ہے، یہ ہے کہ انتخاب میں وہی لوگ حصہ لے سکتے ہیں جو خود سرمایہ دار ہوں یا کسی سرمایہ دار یا سیاسی جماعت کی انہیں حمایت حاصل ہو۔ اس طرح دیکھیں تو درپردہ حکومت وہ لوگ چلاتے ہیں جو سرمایہ دار ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو اپنے صنعتی اور تجارتی مفادات کے علاوہ کسی دوسری بات سے مطلق دلچسپی نہیں ہوتی۔

جمہوریت کے برخلاف اسلام کا شورائی نظام ان سب خرابیوں سے پاک ہے۔ اس میں حکومت کی تشکیل تو انتخاب ہی کے ذریعے سے ہوگی لیکن درج ذیل شرائط کی پابندی لازمی ہے۔

۱- اس انتخاب میں وہی لوگ حصہ لینے کے مجاز ہیں جو اس کے اہل ہوں۔ (سورۂ نساء:۵۸) حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ ''میں نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے

حکومت کے کسی عہدے پر مامور کیا جائے۔آپ ﷺ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا،ابوذر، یہ ایک بھاری امانت ہےاورتم ایک کمزور آدمی ہو۔قیامت کے دن یہ امانت باعث رسوائی ہوگی،مگراس کے لیےنہیں جواس کوحق کے ساتھ اٹھائے اوراس کی ذمہ داریوں کوکما حقہ ادا کرے''۔(۴۵)

اسی تعلیم کااثر تھا کہ خلیفۂ دوم نے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعدفرمایا:

> ''اگر میں جانتا کہ کوئی دوسرا مجھ سے زیادہ امور خلافت کوانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہےتو اس صورت میں منصب خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے مقابلے میں میراقتل کیاجانا میرے لیےزیادہ راحت کاباعث ہوتا''۔(۴۶)

قرآن میں اہلیت کا جومعیار مقرر کیا گیا ہےوہ ''علم وجسم''(۴۷)اورتقویٰ ہے۔

۲- کوئی شخص خودکسی عہدہ کا خواہش مند نہ ہولیکن اگرکوئی ذمہ داری اس کودی جائے تو قبول کرلے۔نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

انا ، واللّٰہ ، لا نولی علی ھذا العمل احدًا سائلہ و لا احدًا حرص علیہ ۔(۴۸)

خدا کی قسم ، میں کسی ایسے آدمی کو انتظام حکومت میں کوئی عہدہ نہ دوں گا جواس کا خواستگار ہواوراس کی حرص رکھتا ہو۔

عہدہ طلب نہ کرنے کی وجہ بھی آپ نے بتادی ہے۔عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

یا عبد الرحمٰن لا تسال الامارۃ ، فانك ان اعطیتھا عن مسئلۃ وکلت الیھا وان اعطیتھا عن غیر مسئلۃ اعنت علیھا ۔ (۴۹)

اے عبدالرحمٰن،امارت طلب نہ کرو،کیونکہ اگروہ تمہیں طلب کرنے پرملی توتمہیں اس کےحوالےکردیاجائے گااوراگربغیر مانگے مل گئی تواللہ کی طرف سے اس کام میں تمہاری مدد کی جائے گی۔

اس سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی قابل ذکر ہے جس میں امارت سے متعلق ایک

استفسار کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اے ابوبکر وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بے رغبت ہو، نہ کہ اس کے لیے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو، وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے، نہ کہ اس کے لیے جو اس پر جھپٹے، وہ اس کے لیے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے، نہ کہ اس کے لیے جو خود کہے کہ یہ میرا حق ہے''۔(۵۰)

عہدہ ومنزلت کی طلب ایک فطری خواہش ہے اور اس سے وہی لوگ بے نیازی اختیار کر سکتے ہیں جن کے نفس پاکیزہ یعنی تقویٰ کے حامل ہوں ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا تو ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

> ''عمر پہلی چیز جس کی طرف سے میں تمہیں ہوشیار رہنے کی نصیحت کرتا ہوں وہ خود تمہارا نفس ہے ۔ ہر نفس کی کچھ خواہش ہوتی ہے اور جب تم اس کی کوئی خواہش پوری کردو گے تو وہ آگے بڑھ کر دوسری خواہش کے لیے مچلنے لگے گا اور دیکھو اصحاب رسول میں سے اس گروہ سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ پھول گئے ہیں، نگاہوں میں ہوس بس گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے، اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے، جب تک تمہاری روش درست رہے گی ، یہ لوگ بھی تمہارے لیے سیدھے رہیں گے''۔(۵۱)

۳- انتخاب غیر جماعتی ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست جسد واحد کی طرح ہے، اس لیے سیاسی اور مذہبی یا کسی اور بنیاد پر جماعت سازی کا مطلب اس کی ہیئت اجتماعی کو نقصان پہنچانا ہے۔اس کے علاوہ اسلام میں فرقہ بندی ممنوع ہے، خواہ یہ سیاسی ہو یا مذہبی ۔فرمایا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا (آل عمران:۱۰۵)

(اے مسلمانو!) ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے باہم تفرقہ اور اختلاف کیا۔

اسلامی نظام حکومت میں مجلس شوریٰ ہی کو حزب اختلاف کی حیثیت حاصل ہے، اس کو پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ غیر جانب دارانہ طور پر حکومت پر تنقید اور اس کا محاسبہ کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے ارکان کا انتخاب غیر جماعتی بنیاد پر ہو۔

۴- امیر ریاست (صدر مملکت) (۵۲) کا انتخاب براہ راست عوام کے بجائے اہل الرائے کے ذریعے سے ہو اور یہ اہل الرائے مجلس شوریٰ کے منتخب ارکان ہوں گے۔ ماضی میں اس کی کئی نظیریں موجود ہیں۔ خلیفۂ اول کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے مشورہ سے ہوا، یہ لوگ اپنی قوم کے اہل الرائے تھے اور سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت مجلس شوری کی تھی۔ اگرچہ خلیفۂ دوم کو نامزد کیا گیا تھا لیکن بعد میں بیعت عام کے ذریعہ جس میں مدینہ کے اہل الرائے شریک تھے، اس نامزدگی کی توثیق ہوئی۔ خلیفۂ سوم کی شہادت کے بعد بدقسمتی سے انتخاب امیر کا طریقہ موقوف ہو گیا اور ملوکیت کا دور شروع ہوا۔

اس میں استثنائی حیثیت اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷-۷۲۰) کی ہے۔ انہوں نے دوبارہ شورائی طریقۂ انتخاب کو اختیار کیا۔ سلیمان بن عبدالملکؒ (۷۱۵-۷۱۷) نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن وہ اس تقرر سے راضی نہیں ہوئے اور اعلان فرمایا:

ایھا الناس انی ابتلیت بھذا الامر من غیر رائی منی ولا طلبة ولامشورة من المسلمین وانی قد خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی فاختاروا لانفسکم غیری (۵۳)	لوگو! مجھے میری رائے اور خواہش، نیز مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر حاکم بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے میں تمہیں اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔ اب تم میرے سوا جس کو چاہو اپنا امیر بنالو۔

چنانچہ اس وقت جو لوگ مسلمانوں کے اہل الرائے تھے انہوں نے اپنی خوشی سے عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا خلیفہ منتخب کرلیا۔ یہ اہل الرائے دراصل اہل استنباط ہیں جن کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (نساء:۸۳)	اگر وہ اس خبر کو رسول اور اپنے اولوالامر تک پہنچا دیتے تو ان میں جو اہل استنباط ہیں وہ (اس خبر کی اصلیت کو بآسانی) جان لیتے۔

اس آیت سے اسلامی نظام حکومت میں اہل الرائے کا مقام اور ان کا کار منصبی بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ حکومت سازی میں اہل استنباط کی رائے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ عوام کا

کام یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا نمایندہ بنائیں جو ان کے درمیان اپنی معاملہ فہمی اور حسن سیرت کے لحاظ سے ممتاز ہوں اور پھر یہ اخیار امت اسلامی ریاست کے امیر کو منتخب کریں۔ یہی طریقہ مطابق عمل ہے اور تجربے اور مشاہدے سے بھی اس کی افادیت ثابت ہوچکی ہے۔(۵۴)

۵-اہل الرائے اور امیر دونوں کا انتخاب سادگی سے ہو۔ ہر امیدوار کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب میں اپنا تعارف کرائے اور بتائے کہ اگر وہ منتخب ہوگیا تو عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کام کرے گا۔ اس مقصد کے لیے پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا کے موجودہ ذرائع کا استعمال پہلے سے مقررہ ضوابط کے مطابق کیا جائے اور اس کا خرچ اسلامی ریاست برداشت کرے۔ آج کل جمہوری ملکوں میں الیکشن کے موقع پر جس طرح تعارف وتشہیر (Campaigning) کے نام پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اور مسرفانہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ سب ممنوع ہوں۔ کسی امیدوار کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ خود کو منتخب کرانے کے لیے اپنی دولت کا بے جا استعمال کرے اور جدید تشہیری وسائل کے ذریعہ سے شور و ہنگامہ کرکے عام لوگوں کے امن وسکون اور کاروباری مشاغل میں خلل انداز ہو۔ جس طرح شخصی تعارف سیدھا اور براہ راست ہوتا ہے اسی طرح انتخابی تعارف بھی سیدھا اور آسان ہونا چاہیے، جیسا کہ اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (احزاب:۷۰)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو۔ (یعنی داؤں پیچ سے کام نہ لو)

گزشتہ صفحات میں جمہوریت اور اسلام کے شورائی نظام کا جو تقابلی تعارف پیش کیا گیا ہے اس سے بالکل واضح ہوگیا کہ ان سیاسی نظاموں میں نہ صرف اصولی اختلاف ہے بلکہ ان کے لائحۂ عمل بھی مختلف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمدنی مسائل کا حل نہ جمہوریت میں ہے اور نہ ہی کسی اور سیاسی نظام میں، ان کا حل صرف اسلام کے شورائی نظام میں ہے جو خدا کے قانون (قرآن) اور مسلمانوں کے اہل الرائے کے مشورہ پر مبنی ہے۔ قانون خداوندی اور مشاورت سے انحراف کا دوسرا نام آمریت اور استبدادی حکومت ہے۔ چونکہ غیر مسلموں کے پاس جمہوریت کا کوئی موزوں متبادل نہیں ہے اس لیے جمہوری نظام ان کے لیے مفید ہے، لیکن مسلمانوں کو اس کی کوئی ضرورت نہیں

کہ ان کے پاس اسلام کا شورائی نظام موجود ہے جو جمہوریت سے بدر جہا فائق ہے۔ وہ ان نقائص سے جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا گیا، بالکل خالی ہے جو جمہوری نظام میں پائے جاتے ہیں۔

حواشی

(۱) تاریخ فلسفہ سیاسیات، محمد مجیب بی اے (آکسن)، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۔ (۲) اس منشور کے متعلق یورپ کے مشہور مورخ لارڈ ایکٹن نے کہا تھا کہ کاغذ کا یہ پرزہ دنیا کے تمام کتب خانوں سے زیادہ وزنی ہے۔ (۳) یہ اصطلاح عربی لفظ 'جمہور' سے وضع کی گئی ہے۔ اس کے معنی ریت کے بلند تودے اور ہر چیز کے بڑے حصے کے ہیں۔ جو زمین اپنے اطراف سے بلند واقع ہو اس کو جمہور کہتے ہیں۔ جماہر القوم کے معنی اشراف قوم کے ہیں۔ جمہوری ایک شراب کا بھی نام ہے، اس لیے کہ اس کو لوگوں کی ایک بڑی تعداد استعمال کرتی ہے۔ (دیکھیں لسان العرب، تحت کلمہ 'جمہور')۔ معلوم ہوا کہ جمہور کے مفہوم میں گروہ کثیر کا مفہوم غالب ہے۔ فقہ میں جب جمہور علماء کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تو اس سے مراد علماء کی اکثریت ہوتی ہے۔ جمہوریت کا لفظ سب سے پہلے اٹھارہویں صدی میں ترکی زبان میں استعمال ہوا۔ یہ فرانسیسی لفظ 'ریپبلک' کا ترجمہ ہے۔

(۴) Democracy and Dictatorship, by Zevedei Barbu. London 1956. P.12۔

(۵) Future of Asian Democracy (Report of a symposium), by Sohan Lal, N.Delhi, 1959, P.5۔

(۶) Democracy and Dictatorship, by Zevedei Barbu. 1956. P.41۔

(۷) ایضاً۔ (۸) ایضاً۔ (۹) Future of Asian Democracy, P.5۔

(۱۰) ایضاً۔ (۱۱) اشارہ کمیونسٹوں کی طرف ہے۔

(۱۲) Future of Asian Democracy , P.6۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۳۔

(۱۴) Western Political Philosophers, by Mauraie Cranston, National Academy Delhi, 1965. P.110۔

(۱۵) Capitalism is as Flawed as Other Systems, by Swaminathan S Anklesaria Aiyar, The Times of India 9Sunday), 19 May, 2002 ,P.5۔

(۱۶) Equal Rights, Duties and Privileges (Letter from America), by T.V. - Parasuram, Indian Express, 1981, P.5.

(۱۷) دیکھیں، الخلافتہ، قاہرہ ۱۳۴۱ھ، ص ۵۔ (۱۸) الفاروق، علمی کتب خانہ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، ۱۹۵۱، حصہ دوم، ص ۲۲۷۔ (۱۹) ماہنامہ اشراق، لاہور، ستمبر ۲۰۰۰، مضمون ''جمہوریت اور اصلاح معاشرہ'' محمد بلال، ص ۹۔ (۲۰) کلیات اقبال (اردو)، ایجوکیشنلبک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲، بانگ درا، ص ۲۶۱، ۲۶۲۔ (۲۱) کلیات اقبال (اردو) ارمغان حجاز، (ابلیس کی مجلس شوریٰ)، ص ۶۴۹، ۶۵۰۔ (۲۲) ایضاً ضرب کلیم، ص ۶۱۰، ۶۱۱۔ (۲۳) کلیات اقبال (اردو)، بال جبریل، ص ۳۳۲۔ (۲۴) اقبال، فکر اسلامی کی تشکیل جدید، مرتبہ ڈاکٹر سید حسین جعفری، عصر حاضر کے تقاضے، اقبال اور اجتہاد، پروفیسر وارث میر، کراچی، ۱۹۸۸، ص ۱۴۱۔ (۲۵) علامہ نے اشتراکیت کے بارے میں لکھا ہے کہ بعض حکماء مثلاً لائی گرگس جو اسبارطہ (اسپارٹا) کا مقنن تھا اور افلاطون نے اشتراکیت کی تحسین کی ہے اور ایک قوم پر اس کا تجربہ بھی کیا تھا۔ لیکن استعدادات کے فرق کی وجہ سے یہ نظام قائم نہ رہ سکا۔ یہ نظام اب بھی موجود ہے اور بعض جماعتیں اس کی داعی و مبلغ ہیں اور عوام الناس کا میلان اس کی طرف زیادہ ہے لیکن امراء و اغنیاء اس کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ نظریہ لوگوں کے اندر اختلاف و عداوت کا ایک ذریعہ بن گیا ہے اور اس سے ایک فتنہ نے جنم لیا ہے جس کی آگ جلد بجھتی نظر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (زخرف: ۳۲)

کیا وہ تمہارے رب کی رحمت کو بھی تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ ہم نے اس دنیا میں ان کے درمیان ان کا رزق تقسیم کردیا ہے اور اس میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور تیرے رب کی رحمت ان کے اندوختہ سے بہتر ہے۔ (فی ملکوت اللہ، ص ۴۶)

(۲۶) فی ملکوت اللہ، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڈھ، ۱۳۹۱ھ، ص ۴۶۔ (۲۷) تدبر، لاہور پاکستان، ماہ جون ۲۰۰۴، ص ۴۹۔ (۲۸) اس کو جمہوریت کے بالمقابل ''شورائیت'' کہہ سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ اصطلاح عربی قواعد کے لحاظ سے صحیح ہو۔ اس کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے ''اللہ کی حکومت، اس کے قوانین اور اہل

الرائے کے مشورے سے، لوگوں کے فائدے کے لیے''۔(۲۹) الفاروق، علامہ شبلی نعمانیؒ، حصہ دوم، ص ۴۸۶۔ (۳۰) سیرت العمرین، ابن جوزیؒ، ص ۱۲۷، مزید دیکھیں عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، مترجم حبیب اشعر مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۵۹۰۔ (۳۱) کتاب الخراج، قاضی ابو یوسفؒ، ص ۷، مزید دیکھیں سیرت العمرین ص ۱۲۷۔ (۳۲) بیہقی (۳۳) تاریخ اسلام، مولانا ابوالمکارم فضل الوہاب، کلکتہ ۱۹۳۶ (طبع پنجم)، حصہ دوم، ص ۱۸، ۱۹، مزید دیکھیں سیرت حضرت ابوبکر، محمد حسین ہیکل۔ (۳۴) الفاروق، حصہ اول، ص ۱۶۴۔ (۳۵) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۴ء، حصہ اول، ص ۲۱۹۔ (۳۶) ایضاً ص ۷۹۔ امام ابن تیمیہؒ (م ۱۳۲۸ء) جیسی عظیم المرتبت علمی و دینی شخصیت کا تعلق عہد مملوک ہی سے تھا۔ (۳۷) صحیح مسلم، باب قطع السارق الشریف، مزید دیکھیں صحیح بخاری، کتاب الحدود، عن عائشہؓ۔ (۳۸) عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے قبطی کو تازیانے مارتے ہوئے کہا تھا ''لے یہ کوڑے، میں شریفوں کا بیٹا ہوں''۔ (۳۹) عمر بن الخطابؓ، علامہ طنطاوی، مترجم عبدالصمد صارم، مطبوعہ البیان لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸۷۔ (۴۰) ایضاً، مزید دیکھیں الفاروق، حصہ دوم، ص ۴۰۹، ۴۱۰، عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، ص ۵۹۵۔ (۴۱) عمر بن الخطابؓ، علامہ طنطاوی، ص ۲۵۴، مزید دیکھیں کتاب الاموال، ابوعبیدہ، ص ۳۰۔ (۴۲) الفاروق، حصہ دوم، ص ۳۷۵۔ (۴۳) تفصیل کے لیے دیکھیں عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، ص ۵۹۴، ۵۹۵۔ (۴۴) تاریخ فلسفۂ سیاسیات، محمد مجیب، ص ۱۳۱۔ (۴۵) صحیح مسلم، باب کراہۃ الامارۃ۔ (۴۶) عمر بن الخطابؓ، طنطاوی، ص ۷۰۔ (۴۷) علم و جسم (بقرہ: ۲۴۷) سے مراد یہ ہے کہ قاید بدنی لحاظ سے توانا اور جری اور دماغی اعتبار سے قوی ہو یعنی معاملہ فہم اور دور اندیش۔ تقویٰ کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن اس کا کم سے کم مفہوم یہ ہے کہ وہ دیانت دار اور جاہ و مال سے بے نیاز ہو۔ افلاطون نے محافظین ریاست کے لیے چار صفتوں کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، علم، شجاعت، عفت اور عدل، دیکھیں ریاست (ریپبلک)، مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین، انجمن ترقی اردو دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۲۲۶ تا ۲۴۱۔ (۴۸) صحیح مسلم و بخاری، مزید دیکھیں ابوداؤد۔ (۴۹) صحیح مسلم۔ (۵۰) صبح الاعشی، قلقشندی، بحوالہ اسلامی ریاست، مولانا مودودیؒ، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۳۷۷، (مولانا نے تصریح کر دی ہے کہ یہ اثر حدیث کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے)۔ (۵۱) کتاب الخراج، امام ابو یوسفؒ، مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مکتبہ چراغ راہ کراچی، ص ۱۲۶۔

قانون اسلام میں غلامی کا تصور اور عصر حاضر میں اس کی ممانعت کی شرعی حیثیت

جناب ابوالحسن شبیر احمد

ایک انسان کا دوسرے انسان کی ماتحتی میں رہ کر کام کرنا اور خدمات پیش کرنا ایک مستحسن معاملہ ہے اور فطرت انسانی کے مطابق ہے۔

یہ ماتحتی ایک طرح کی جزوی سپردگی ہوتی ہے جو مفاد عامہ یا معاوضہ کے حصول کے لیے باہمی رضامندی سے ایک پروقار معاہدہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آتی ہے۔ اس میں دونوں طرف کے افراد اپنے اپنے وعدہ کے پابند ہوتے ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے وعدہ کا پاس نہ رکھے تو دوسرا فریق بھی اپنا وعدہ توڑنے کا حق دار ہوتا ہے۔

غلامی اس کے برعکس ایک جبری ماتحتی ہے۔ عربی زبان میں اس کے لیے لفظ رِق (را کی زیر کے ساتھ) استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی باریکی اور کمزوری کے ہیں۔ اس مناسبت سے جو انسان کسی دوسرے انسان کی ملکیت میں ہو اسے رقیق کہا جاتا ہے۔ (۱)

فقہی اصطلاح میں غلامی کا یہ مفہوم بتایا گیا ہے:

عجز حکمی لا یقدر صاحبه به علی التصرفات والولایات (۲)

یہ ایک صفاتی اور معنوی قسم کا ضعف ہے جس وجہ سے ایک فرد اپنے تصرفات میں بے اختیار ہوتا ہے اور وہ کسی معاملہ کا سرپرست بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اس طرح غلامی کا یہ مفہوم بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی سپردگی اور ماتحتی ہے جس میں ایک فرد جبری تسلط کے تحت اپنے تصرفات میں نااہل بنا دیا جاتا ہے اور اسے مکمل اور ہمہ وقتی تابع

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور۔

داری کے طور پر خدمات ادا کرنا ہوتی ہیں اور یہ سپردگی نسل در نسل جاری رکھی جاتی ہے۔

اقوام عالم میں غلامی کا تصور: غلامی دنیائے انسانیت کا ایک قدیم اور محبوب مشغلہ رہا ہے، ہر طاقت ور قوم اپنی مغلوب و مجبور اقوام کو بلا وجہ اپنا غلام بنا لیتی تھی اور اپنے گھروں، کھیتوں، کاروباری مراکز اور دیگر مقامات پر ان سے انتھک کام کرایا جاتا۔ اس دوران مالک کو غلام پر ہر طرح کی زیادتی کرنے کا قانونی حق حاصل تھا اور جانوروں کی طرح ان کی تجارت بھی ہوتی تھی۔

قدیم اقوام میں اہل مصر، ہنود اور فارسیوں کے یہاں انہیں ادنیٰ حقوق بھی حاصل نہیں تھے اور کسی بھی غلطی کے ارتکاب پر انہیں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ (۳)

یونانی اور رومی تہذیب میں بھی غلاموں کو حیوانات کی طرح استعمال کیا جاتا اور ان کی تحقیر و تذلیل اور ظلم و زیادتی کو آخری حد تک پہنچا دیا گیا۔ (۴) یہودیوں کے ہاں اپنی قوم کا تقدس ان کی کتاب مقدس سے ثابت ہے۔ (۵) قرآن مجید میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا:

نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ (۶) ہم اللہ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں۔

چنانچہ تورات میں اپنے عبرانی بھائیوں اور اجنبی اقوام میں فرق کرنے کا صریح حکم موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ جو جانور مر جائے وہ تم خود نہ کھانا بلکہ کسی اجنبی کو دے دینا کیونکہ تم مقدس قوم ہو۔ (۷) ایک اور مقام پر ہے کہ اپنے اسرائیلی بھائی کو سود پر قرض نہ دینا مگر پردیسی کو دے دینا۔ (۸)

یہی نظریہ تلمود میں اضافہ کے ساتھ پیش کیا گیا کہ "اسرائیلی کی گری پڑی چیز مل جائے تو اعلان کر کے واپس کی جائے اور غیر اسرائیلی کی چیز اپنے پاس رکھ لی جائے اور اگر اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا مقدمہ عدالت میں آئے تو یہودی قاضی کو چاہیے کہ جس طرح ممکن ہو اپنے قومی بھائی کو جتوانے کی کوشش کرے۔ (۹) اس لیے قرآن حکیم میں یہود کا یہ قول درج کیا گیا کہ:

لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ (۱۰) ہمیں (غیر یہودی) جاہلوں کے حقوق سلب کر لینے میں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہود کے نزدیک جب غیر اقوام کے حقوق کی یہ حالت ہے تو غلام کی کیا حیثیت ہوگی۔

غلامی کا تصور بھی تورات میں واضح طور پر موجود ہے۔ (۱۱) اور ان پر ظلم نہ کرنے کا حکم

بھی دیا گیا ہے۔ (۱۲) لیکن تورات قومی اور غیر قومی غلاموں میں فرق کرتے ہوئے یہ تعلیم دیتی ہے کہ عبرانی غلام اور لونڈی کو چھ سال تک غلامی میں رکھ کر ساتویں سال آزاد کر دینا چاہیے۔ (۱۳)

اس سے معلوم ہوا جب ان کے مذہب میں اپنے مقدس قومی بھائی کو ساتویں سال جا کر آزادی ملتی ہے تو غیر اسرائیلی غلام کی آزادی کا تصور کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے۔

چنانچہ تاریخ بتاتی ہے یہود محض غلاموں سے خدمت ہی نہیں لیتے تھے بلکہ انہیں غلاموں کی تجارت میں بھی شہرت حاصل تھی۔ قرون وسطیٰ کے یورپ میں غلاموں کی تجارت کا بڑا حصہ انہیں کے تصرف میں تھا۔ (۱۴) اس کے علاوہ امریکہ میں بھی غلاموں کی خرید و فروخت کا بازار انہیں کے سبب گرم تھا، وہ سیاہ فام افریقیوں کے بھرے ہوئے جہاز لا کر فروخت کرتے تھے اور اس دوران دس سے پندرہ فی صد غلام لقمۂ اجل بن جاتے تھے۔ (۱۵)

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے، ان کے پولوس رسول نے افسیون کے خط میں لکھا ہے کہ غلام اپنے مالک کی اس طرح اطاعت کریں جس طرح وہ حضرت مسیحؑ کی اطاعت کرتے ہیں۔ (۱۶) اس لیے ان کے چرچ میں ہمیشہ غلام رکھے گئے اور کبھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ (۱۷)

عیسائیوں کے ہاں بھی غلام سے وہی رویہ اختیار کیا گیا جو عموماً پوری دنیا میں اپنایا گیا ہے۔ جیسا کہ ۱۶۸۵ء میں مملکت فرانس نے یہ قانون بنایا کہ اگر زنجی غلام نے کسی آزاد پر کوئی زیادتی کی یا چوری کی تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر کوئی غلام پہلی یا دوسری بار بھاگ گیا تو اس کے کان کاٹ کر اسے گرم لوہے سے داغا جائے گا اور اگر وہ تیسری بار بھاگا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (۱۸)

یہ ہے وہ تصور غلامی جو قدیم زمانے سے پوری دنیا میں عموماً اور قرون وسطیٰ کے یورپ اور امریکہ میں خصوصاً انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک قائم رہا۔ لیکن اس کے برعکس ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے انسانیت کو جو اسوۂ حسنہ عطا فرمایا اس میں غلامی کا تصور ایک بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔

اسلام میں غلامی کا تصور اور اس کا محدود جواز: اسلام نے پہلے انسان کو خلیفۂ خداوندی، (۱۹) مسجود ملائکہ، (۲۰) چنی ہوئی شخصیت اور پہلے نبی کے طور پر (۲۱) پیش کیا، انسان کو ایک عظیم تر مخلوق کا خطاب دیا (۲۲) اور انسانوں کے مابین ہر قسم کی تفریق کو رد کرتے ہوئے سب کو ایک

والدین کی اولاد (۲۳) اور بھائی بھائی قرار دیا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''غلام تمہارے بھائی ہیں جس طرح تم کھاتے ہو اسی طرح ان کو کھلایا کرو۔ (۲۴) ایک مقام پر فرمایا کہ کوئی شخص اپنے والد کے احسانات کا بدلہ اس وقت تک نہیں اُتار سکتا جب تک کہ وہ اپنے والد کو غلام پائے اور اسے خرید کر آزاد کر دے''۔ (۲۵)

اس حدیث پاک میں آزادی کو وجود انسانی سے اور غلامی کو انسانیت کے عدم وجود سے تشبیہہ دی گئی ہے، جس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام کے نزدیک آزادی ہی زندگی ہے اور غلامی محض ذلت کی زندگی نہیں بلکہ موت کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قتل خطاء کے کفارہ میں ایک مومن غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (۲۶)

اسلام میں بلاوجہ کسی کو گرفتار کر کے غلام بنانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''جس نے کسی آزاد انسان کو پکڑ کر بیچا اور اس کی قیمت کو استعمال کیا تو میں قیامت کے دن اس کے خلاف ہوں گا''۔ (۲۷)

البتہ ایک ایسی صورت تھی جسے اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے ان کے داخلی اور خارجی معاملات کے حوالے سے ضروری تھا کہ ہر قوم جنگی قیدیوں کو اپنا غلام بنا لیتی تھی۔ اگر مسلمان اپنی فتوحات میں گرفتار کیے جانے والے دشمنوں کو چھوڑ دیتے تو ایک طرف اپنے مسلمان قیدیوں کو آزاد کرانا مشکل ہو جاتا اور دوسری جانب کفار کے جنگی قیدیوں کو یک طرفہ طور پر چھوڑ دینا مسلمانوں کے اندر سخت قسم کی افراتفری پھیلنے کا باعث بنتا، شر پسند دشمن قوتیں اس سے فائدہ اٹھاتیں اور اس طرح ان سے مقابلہ کرنا اور انسانیت پر تہذیب اسلامی کے اثرات مرتب کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلامی مسلم معاشرہ کا کوئی مستقل حصہ نہیں ہے بلکہ اسے اپنے وقت کے بین الاقوامی حالات کے تحت اسیران جنگ کے مسئلہ کے حل کے طور پر گوارا کر لیا گیا تا کہ جب تک بین الاقوامی سطح پر انسانی مساوات کا شعور پیدا نہیں ہو جاتا اس وقت تک اسے محدود طور پر جائز رکھا جائے۔ (۲۸) اس طرح انہیں یہ موقع دیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے تہذیب اسلامی کا مشاہدہ کر کے اسلام کو سمجھ سکیں۔ اس لیے فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ انسان کی اصل فطرت آزادی ہے اور غلامی ایک عارضی چیز ہے۔ (۲۹)

غلامی کی عارضی اجازت دے کر انہیں اپنے تصرفات میں بے اختیار کر دیا گیا تا کہ معاشرے میں کفر کے نظری و عملی اثرات نہ پھیل سکیں لیکن اس کے ساتھ ان کی ضروریات زندگی، عزت نفس اور ان کے حقوق کا مکمل خیال رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے متعلق اخلاقی اور قانونی ضوابط کا پابند بنا دیا گیا۔ ذیل میں مختصر طور پر غلاموں کے بارے میں اسلام کے چند اہم اقدامات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱- غلاموں کی آزادی کے عمل کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ اسے انفرادی اور اجتماعی سطح پر عبادات کا حصہ بنا دیا گیا۔ جیسا کہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف آزادی ہے۔ (۳۰) اس میں ریاست کی ذمہ داری بن گئی کہ ہر سال زکوٰۃ کی رقم کا ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کیا جائے۔

زکوٰۃ کے بعد روزہ اسلام کی اہم عبادت ہے اور اسے جان بوجھ کر توڑ دینا ایک نا قابل تلافی جرم بتایا گیا ہے۔ (۳۱) لیکن اس جرم کی تلافی کے لیے تین کفاروں میں سے پہلا کفارہ ایک غلام کی آزادی ہے۔ (۳۲)

۲- غلاموں کی آزادی کو اللہ کی خوشنودی اور گناہوں کی بخشش کا سبب قرار دے کر قرآن وسنت میں بار بار غلام آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی۔ بعض بڑے گناہوں، قتل خطاء، (۳۳) قسم توڑ دینے (۳۴) اور ظہار (۳۵) کے کفارات میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ ان گناہوں میں عہد الٰہی کا نقض اور انسانی تحقیر کا عمل موجود ہے اس مناسبت سے انسانی آزادی کے عمل سے ان کی تلافی کا حکم دیا گیا ہے۔ ایسے ہی گناہوں کی معافی اور عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے سورج اور چاند گرہن کے موقع پر بھی غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ (۳۶)

رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ ''جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کر دے اس کے ہر عضو کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آزاد کرنے والے کے ایک ایک عضو کو جہنم کی آگ سے نجات بخشیں گے''۔ (۳۷) اس سے معلوم ہوا غلامی ایک آگ ہے۔ لہذا بلا وجہ کسی کو غلام بنانا اپنے آپ کو جہنم میں ڈالنے کے مترادف ہے اور کسی کو اس آگ سے نکالنا اپنے آپ کو جہنم سے آزاد کرانے کے برابر ہے۔ اس حدیث میں غلام کے ہر عضو کا ذکر یہ واضح کرتا ہے کہ غلامی کے ہر عضو کے لیے آگ کی طرح

تکلیف کا باعث بنتی ہے اور پیغمبر اسلام کو انسانیت کے اس درد کا مکمل احساس ہے اور اس لیے آپ ﷺ کی آخری وصیت یہی ہے کہ اپنی نمازوں اور غلاموں کا خاص خیال رکھنا۔ (۳۸)

۳- قرآن مجید میں غلاموں کی آزادی پر رقم صرف کرنے کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ اسے اسلام کی بلند ترین نیکیوں میں شامل کر کے ایمانیات کے بعد اور اقامت صلوٰۃ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ (۳۹)

اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے تریسٹھ غلام آزاد کیے اور حضرت عائشہؓ نے سڑسٹھ، ابن عباسؓ نے ستر، حکیم بن حزامؓ نے ایک سو، ابن عمرؓ نے ایک ہزار، ذوالکلاح حمیریؓ نے آٹھ ہزار اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار کو آزادی بخشی۔ (۴۰)

۴- اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے مختلف کشادہ راہیں کھولیں۔ جیسا کہ جنگی قیدیوں کے متعلق تین اختیارات میں سے پہلا اختیار یہ دیا گیا کہ انہیں بغیر کسی تاوان کے آزاد کر دیا جائے۔ (۴۱)

غلاموں کو آزاد کرنے کی ایک نئی راہ مکاتب اور مدبر (۴۲) بنانے کے ذریعے سے بھی کھولی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تمہیں ان میں کوئی بھلائی (یعنی اپنی قیمت ادا کر دینے کی صلاحیت) نظر آتی ہو تو تم انہیں آزادی کی تحریر لکھ دو۔ (۴۳) بعض علماء نے اسے وجوبی حکم قرار دیا ہے (۴۴) اور یہی رائے حضرت عمرؓ کی معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت انسؓ کا ایک غلام ان سے یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ اسے مکاتب بنا دیں تو حضرت انسؓ کے انکار پر غلام نے حضرت عمرؓ سے شکایت کر دی تو حضرت عمرؓ نے ان کو چھڑی مارتے ہوئے فرمایا اللہ کا حکم پورا کرو۔ (۴۵)

ایک ایک باندی اپنے مالک کے بچے کو جنم دے تو اسے ''ام الولد'' کا نام دے کر مالک کی وفات پر آزاد تسلیم کیا گیا (۴۶) اور اس کے ساتھ مکاتب، مدبر اور ام ولد کی خرید و فروخت ممنوع کر دی گئی۔ (۴۷)

ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ اگر کوئی فرد اپنے کسی قرابت دار کا مالک بن جائے تو اس کی ملکیت واقع ہوتے ہیں وہ قرابت دار آزاد ہو جائے گا۔ (۴۸)

۵- زندگی کے تمام معاملات میں غلام کو مساویانہ حقوق دینے کے لیے غلام سے حسن

سلوک کرنا صرف لازم ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسے دین کے اساسی احکام میں شامل کیا گیا۔(۴۹)

۶- غلاموں کی بنیادی ضروریات، خوراک، لباس، تعلیم و تربیت، رہائش اور صحت وغیرہ کی مناسب فراہمی ان کے سر پرستوں پر قانونی طریقے سے واجب کردی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے"یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے انہیں تمہارے تابع کردیا ہے اور جس کا بھائی اس کے تابع ہو اس پر ضروری ہے کہ وہ جس طرح کھانا خود کھائے اس طرح کا کھانا سے کھلائے اور جس طرح کے کپڑے خود پہنے اسی طرح اسے پہنائے۔(۵۰) ایک اور حدیث میں ہے کہ کسی کے گناہ گار ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو خوراک مہیا نہ کرے۔(۵۱) اس حوالے سے کتب حدیث اور فقہ میں غلاموں کے حقوق پر مستقل ابواب موجود ہیں۔(۵۲)

۷- دیگر ضروریات کی طرح نکاح بھی انسانی اہم ضرورت ہے۔اس لیے اسلام میں غلاموں اور لونڈیوں کا باہمی نکاح اور آزاد افراد سے بھی ان کا نکاح مالک کی اجازت اور مناسب شرائط واحکام کے ساتھ جائز قرار دیا گیا۔(۵۳) اس حوالے سے قرآن مجید میں غلام اور آزاد کے فرق کو ختم کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ایمان کو حقیقی وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔(۵۴) مفسرین نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ قرآن پاک اس سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان اور اخلاق میں آزاد عورت سے بہتر بھی ہوسکتی ہے۔(۵۵)

۸- اسلام نے قریبی رشتہ رکھنے والے غلاموں کے متعلق یہ بھی فیصلہ کیا کہ انہیں ایک مقام پر اکٹھے رکھا جائے اور ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جائے۔(۵۶)

۹- مالک کو پابند کیا گیا کہ وہ قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے غلام سے خدمات حاصل کرے۔فرمان نبوی ﷺ ہے کہ وہ اس کی طاقت سے زیادہ اس پر کام کا بوجھ نہ ڈالے اور اگر کوئی مشکل کام کرانا ضروری ہو تو اس میں اس کی مدد کی جائے۔(۵۷)

اس کے ساتھ غلام کو یہ حق بھی دیا گیا کہ اسے کوئی شکایت ہو تو عدالت کی طرف رجوع کرے اور عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے انصاف مہیا کرے۔(۵۸) اس طرح غلام کو حق قصاص دیا گیا (۵۹)۔ مالک کی طرف سے معمولی زیادتی پر غلام کو آزاد کرنے کا حکم صادر کیا گیا (۶۰) اور حضرت عمرؓ نے ایک مقدمہ میں مالک کو سو کوڑوں کی سزا دی۔(۶۱)

عصر حاضر میں غلامی کی ممانعت اور اس کی شرعی حیثیت: برطانوی حکومت نے ۱۸۳۲ء میں غلامی کا سلسلہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر امریکہ نے ۱۸۶۵ء میں اس کی پیروی کی اور آہستہ آہستہ دیگر ممالک اور مسلم ممالک بھی اس فیصلہ میں شریک ہوگئے۔ سعودی عرب نے ۱۹۲۷ء میں اس معاہدہ میں شرکت کی۔ (۶۲) آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کی شق نمبر ۱۱ میں درج ہے کہ غلامی کا کوئی وجود نہیں اور کسی کو غلام بنانا اس کے بنیادی انسانی حق کی خلاف ورزی ہے۔ تو اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا غلامی کی ممانعت کے اس فیصلے سے وہ اسلامی احکام منسوخ سمجھے جائیں گے جو غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق کتاب وسنت اور فقہی کتب میں موجود ہیں اور زیادہ اہم سوال یہ کہ کیا انسان اللہ کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلاموں کی آزادی کی تحریک کا آغاز تو خود اسلام نے کیا ہے اور یہ قرآن ہی تو کہہ رہا ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ (۶۳)

تم ایک دشوار گذار پہاڑی راستہ پر نہیں چلے اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟ وہ غلاموں کی آزادی ہی تو ہے۔

اس آیت مبارکہ میں آزادی کی ترغیب ایک انوکھے انداز سے دی گئی ہے اور قرآن مجید نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ کام جتنا تمہارے لیے مشکل ہے اس کا بھی تمہیں ادراک نہیں ہے۔ ساتھ یہ اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا مکمل ادراک حاصل ہے کہ کوئی قوم اپنے قدیمی فائدہ مند رواج و عادت کو آسانی سے ترک نہیں کرسکتی اور اپنے مفاد کے خلاف ایک اہم نظریہ کو جلدی سمجھ بھی نہیں سکتی۔

یہ حالات تو اس دور کے تھے جب قرآن نازل ہورہا تھا اور اب معاملہ مختلف ہے کہ اسلام کی تحریک آزادی سے متاثر ہوکر خود غیر مسلم اس غلامی کو ممنوع قرار دے رہے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ غلامی کے جس محدود جواز کو اسلام نے اختیار کیا تھا اس کی اصل وجہ خود کفار کی اجارہ داری تھی۔ ورنہ خالق کائنات یہ نہیں چاہتا کہ اس کا نائب ایک انسان کسی دوسرے انسان کے زیردست ہو اور پوری زندگی اس کی انسانیت مجروح ہوتی رہے، اسی حال میں سسک سسک کر مرجائے اور اس کی نسلیں غلامی کے طوق میں جکڑی رہیں۔

اس لیے عصر حاضر کے کفار کا غلامی کو ممنوع قرار دینا درحقیقت ان کا اسلام کے ایک فطری حکم کی طرف لوٹ آنا ہے اور یہ بات مسلمانوں کے لیے مسرت آمیز ہے۔ اب اگر مسلمان اس کارِ

میں پیچھے رہ جاتے تو یہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہوتا۔

لہٰذا اس معاہدہ میں مسلمانوں کی شرکت سے احکام اسلام کی تنسیخ نہیں ہو رہی بلکہ یہ زمانے کے تقاضوں سے اسلام کی تطبیق ہے۔ کیونکہ انسانوں کی غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے اسلامی تعلیمات میں غلامی کا محدود جواز اختیار کرنا اپنے وقت کے تقاضے کو پورا کرنا تھا اور اب اللہ کے حکم کی طرف غیر مسلموں کے لوٹ آنے سے یہ بھی وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہوں۔

اس معاہدے سے مسلمانوں کا اجتماعی فائدہ غیر مسلموں کی بہ نسبت زیادہ ہے کیونکہ اس سے قبل مسلمان تو کفار کے صرف جنگی قیدیوں کو غلام بنا سکتے تھے اور ان سے حسن سلوک کے بھی پابند تھے لیکن کفار تو جنگ کے علاوہ بھی کمزور مسلمانوں کو جہاں پاتے غلام بنانا عموماً اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس لیے اس معاہدہ سے عالم اسلام کو خصوصاً اور عالم دنیا کو عموماً تحفظ حاصل ہوا۔

اب اگر کفار آگے چل کر یہ معاہدہ توڑ دیں تو مسلمان بھی غلامی کے محدود جواز کی طرف دوبارہ لوٹ جائیں گے۔ اس لیے اس معاہدہ سے شرعی احکام کا نسخ نہیں ہو سکتا۔ جو حکم کسی تقاضے کے تحت ہو تو اس کے تقاضے کی عدم موجودگی میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً طلاق کی اجازت ہے لیکن ہر جگہ اس کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ حالات سے مجبور ہو کر اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہی حال غلامی کا ہے۔ علاوہ ازیں اسلام کا یہ اصول ہے کہ اجتماعی مصالح کے لیے انفرادی فوائد کی قربانی دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاہدہ صلح حدیبیہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ کی شرائط تسلیم کر لیں تو حضرت ابوجندلؓ کو نہ چاہتے ہوئے کفار کے سپرد کرنا پڑا۔ (۶۴)

خلاصۂ بحث: اسلامی اور غیر اسلامی تصورات غلامی کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیر اسلامی تصور غلامی، لامحدود ملکیتی اختیارات کے باعث، ظالمانہ اور جابرانہ تصور ہے، جس میں غلام سے نہ صرف حد سے زیادہ کام لیا گیا بلکہ اسے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا، سخت ترین سزائیں دی گئیں اور مالک اور غلام دونوں کی وفات کے بعد اس درندگی کا سلسلہ نسل در نسل جاری رکھا گیا۔

مگر اسلام نے مسلم و کافر اور خاندانی و غیر خاندانی کی تفریق سے بالاتر ہو کر انسانی حقوق کا غیر جانب دارانہ نظام دیا ہے۔ جبری غلامی کا سلسلہ ختم کر کے اسے جنگی قیدیوں تک محدود کیا گیا۔ پھر بے ضرر قیدیوں کے لیے آزادی کی متعدد صورتیں پیدا کی گئیں۔ مدبر، مکاتب ام ولد اور دیگر

احکام کے باعث نسل درنسل غلامی کے اجراء کو روکا گیا۔ اس کے بعد جو غلام بچ گئے ان کے تمام حقوق کا تعین کیا گیا۔ مالک کو ہر طرح کی زیادتی سے منع کر کے غلاموں کو برابری کی سطح پر باعزت زندگی دی گئی کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام فرماتے ہیں اور لوگ جن بوجھوں تلے پسے ہوئے تھے اور جن طوقوں میں جکڑے ہوئے تھے انہیں ان سے آزاد کرتے ہیں۔(۶۵)

اسلام نے یہ واضح کیا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خرید کردہ غلام ہے(۶۶) اور غیر محدود تصور غلامی صرف اللہ اور بندے کے درمیان ہے اور بندوں کے مابین ایسا تصور پیدا کرنا شرک ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کوئی مالک اپنے آپ کو مالک اور آقا اور غلام کو اپنا بندہ اور غلام نہ سمجھے بلکہ اسے نوجوان اور بیٹا جیسے الفاظ سے مخاطب کرے''۔(۶۷)

اسلامی نظام حیات نے غلاموں کو اس قدر باعزت مقام دیا کہ لفظ غلام بھی ان کے بلند مرتبے کی پروقار علامت بن گیا، تاریخ شاہد ہے کہ غلام مسلم گھرانوں کا جز بن گئے وہ ان کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے، اکثر ایک معاہدہ کے تحت ایک غلام کچھ عرصہ تک کام کرتا اور اپنی آمدنی جمع کر کے اس قبیلے کی لڑکی سے شادی کر لیتا۔(۶۸) چنانچہ خلافت عثمانیہ کے خلفاء لونڈیوں کی اولاد تھے اور مصر میں مملوک خاندان نے ایک عرصہ تک حکومت کی۔(۶۹)

لہٰذا اسلام کا تصور غلامی فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور اس کی حیثیت فطری مزدوری اور ملازمت جیسی ماتحتی کے قریب تر ہے۔ اور وہ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے فرسودہ تصورات سے ہی بہتر نہیں بلکہ اسے مزدوری کے جدید سرمایہ دارانہ تصورات پر بھی مکمل طور پر برتری حاصل ہے۔

عصر جدید میں عالمی سطح پر انسانی مساوات کے شعور کی بیداری کے باعث مسلمانوں کے بشمول دنیا کے تمام لوگوں کا ابطال غلامی پر اتفاق ہو چکا ہے۔(۷۰) اس لیے مسلم فقہاء کے نزدیک اب غلامی کے تفصیلی مسائل بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔(۷۱)

اسلام سراپا بھلائی، خیر خواہی اور فطری پاکیزہ سچائیوں کا نام ہے۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ وقت کی تنگنائیوں سے اس سچائی کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے تا کہ اسلامی مقاصد و مصالح کو مد نظر رکھ کر تبدیلی احوال کے ساتھ اسلامی سچائی کو جدید پیرائے میں پیش

کیا جا سکے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) افریقی، ابن منظور، لسان العرب (دار صادر بیروت، طبع اول، ۱۹۹۰ء)، ۲۷۰/۳۔ (۲) احمد نگری، قاضی عبدالنبی، جامع العلوم فی اصطلاحات الفنون، (موسسۃ العلمی للمطبوعات بیروت، طبع دوم، ۱۹۷۵ء) ۱۴۲/۲، الموسوعۃ الفقہیہ، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ، (کویت، طبع دوم، ۱۹۹۲ء) ۱۲/۲۳۔ (۳) وجدی، محمد فرید، دائرۃ المعارف القران العشرین، (دار المعرفۃ بیروت، طبع سوم، ۱۹۷۱ء) ۲۷۵/۴-۲۷۶۔ (۴) ایضاً۔ (۵) کتاب مقدس، پرانا عہد نامہ، خروج (پاکستان بائبل سوسائٹی، لاہور، ۱۹۶۲ء) ۱۹: ۱-۶، ص ۷۱؛ استثناء، ۱۴: ۲، ص ۱۸۰۔ (۶) القرآن الکریم: ۵: ۱۸۔ (۷) کتاب مقدس، پرانا عہد نامہ، استثناء، ۱۴: ۲، ص ۱۸۰۔ (۸) ایضاً، ۲۳: ۱۹-۲۰، ص ۱۸۸۔ (۹) مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، (ترجمان القرآن لاہور، طباعت ۱۷، ۱۹۸۰ء) ۲۶۶/۱۔ (۱۰) القرآن اکریم: ۳: ۷۵۔ (۱۱) کتاب مقدس، پرانا عہد نامہ، استثناء، ۱۲: ۱۲، ص ۱۷۸؛ ۱۶: ۱۱-۱۶، ص ۱۸۲۔ (۱۲) ایضاً، ۲۴: ۱۴-۱۵، ص ۱۸۹۔ (۱۳) ایضاً، ۱۵: ۱۲-۱۷، ص ۱۸۱۔ (۱۴) مجاہد مرزا، ڈاکٹر، یہودیوں کا نسلی تفاخر، (بک ہوم لاہور، ۲۰۰۶ء) ص ۶۷۔ (۱۵) ایضاً ص ۶۹۔ (۱۶) کتاب مقدس، نیا عہد افسیون، ۶: ۵، ص ۱۸۸ (۱۷) دائرہ معارف القرن العشرین، ۲۷۸/۴۔ (۱۸) ایضاً ۲۷۷/۴۔ (۱۹) القرآن الکریم: ۲: ۳۰۔ (۲۰) ایضاً ۲: ۲۴۔ (۲۱) ایضاً ۳: ۳۳۔ (۲۲) ایضاً ۱۷: ۷۰۔ (۲۳) ایضاً ۴۹: ۱۳۔ (۲۴) بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، (دار السلام، ریاض، طبع دوم، ۱۹۹۹ء) ص ۴۱۱، حدیث نمبر ۲۵۴۵۔ (۲۵) مسلم، ابن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح، (دار السلام ریاض، طبع دوم، ۲۰۰۰ء) ص ۶۵۷، حدیث نمبر ۳۷۹۹۔ (۲۶) القرآن الکریم: ۴: ۹۲۔ (۲۷) بخاری، الجامع الصحیح ص ۳۶۱، حدیث نمبر ۲۲۷۰۔ (۲۸) اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، (انجمن خدام القرآن لاہور، طبع سوم، ۱۹۷۶ء) ۵۲/۲۔ (۲۹) بہوتی، منصور یونس، کشاف القناع، (عالم الکتب بیروت، تاریخ طبع ندارد) ۲۲۶/۴؛ ابن نجیم، زین الدین، بحر الرائق، (ایچ، ایم سعید کمپنی کراچی، تاریخ طبع ندارد)، ۱۴۴/۵۔ زحیلی، وہبہ، الفقہ الاسلامی وادلتہ، (دار الفکر دمشق، تاریخ طبع ندارد)، ۶۶/۵۷۔ الموسوعۃ الفقہیہ ۱۳/۲۳۔ قاسمی، محمد جمال الدین، تفسیر محاسن التاویل، (دار احیاء الکتب العربیہ عیسیٰ البابی الحلبی وشرکاءہ قاہرہ، طبع اول، ۱۹۶۰ء) ۶۱/۱۷-۶۳۔ (۳۰) القرآن الکریم: ۹: ۶۰۔ (۳۱) بخاری، الجامع الصحیح ص ۳۱۱، (کتاب الصوم، باب نمبر ۲۹، حدیث نمبر ندارد)۔ (۳۲) ایضاً، حدیث نمبر ۱۹۳۶۔ (۳۳) القرآن الکریم: ۴: ۹۲۔ (۳۴) ایضاً، ۵: ۸۹۔ (۳۵) ایضاً، ۵۸: ۳۔ (۳۶) بخاری، الجامع الصحیح ص ۴۰۷، حدیث نمبر ۲۵۱۹-۲۵۲۰۔ (۳۷) ایضاً، حدیث نمبر

۲۵۱۷۔(۳۸)ابن ماجہ،السنن،(دارالفکر بیروت،۱۹۹۵ء)۱۰۱/۲۔(۳۹)القرآن الکریم:۲:۱۷۷۔(۴۰)اردو دائرہ معارف اسلامیہ،(دانش گاہ پنجاب لاہور،طبع اول،۱۹۸۲ء)۵۶۷/۱۴۔(۴۱)القرآن الکریم:۴:۴۷۔(۴۲)مکاتب وہ غلام ہے جس کا مالک اس کی قیمت متعین کر کے اسے یہ تحریر کردے کہ اگر وہ کچھ عرصہ میں اپنی قیمت ادا کردے تو وہ آزاد ہوگا اور مدبر وہ غلام ہے جس کا مالک یہ طے کردے کہ غلام اس کی وفات کے بعد آزاد ہوگا،(سکروڈھوی،مولانا جمیل احمد،اشرف الہدایہ،مکتبہ رحمانیہ لاہور،طبع ندارد)،۱۷۰/۸۔(۴۳)القرآن الکریم:۲۴:۳۳۔(۴۴)یہ قول معروف مفسر حضرت عطاء کا ہے۔بخاری،الجامع الصحیح،ص۴۱۳(کتاب المکاتب،باب نمبر ۱)۔(۴۵)ایضاً۔(۴۶)مالک،ابن انس،الموطا،مترجم وحید الزمان،(مکتبہ دارالعلم لاہور،۲۰۰۳ء)ص۳۹۰۔(۴۷)دارقطنی،علی بن عمر،السنن،مع التعلیق المغنی،(دارنشر الکتب الاسلامیہ لاہور،تاریخ طبع ندارد)،۱۳۴/۳۔(۴۸)ابن ماجہ،السنن،۴۵/۱۔(۴۹)القرآن الکریم:۴:۳۶۔(۵۰)بخاری،الجامع الصحیح،ص۴۱۱،حدیث نمبر ۲۵۴۵۔(۵۱)مسلم،الجامع الصحیح،ص۴۰۴،حدیث نمبر ۲۳۱۲۔(۵۲)بیہقی،ابوبکر احمد بن حسین،السنن الکبری،(مجلس دائرہ المعارف العثمانیہ،حیدرآباد دکن انڈیا،طبع اول،۱۹۳۵ء)۶/۸۔شافعی،محمد بن ادریس،کتاب الام (دارالمعرفۃ بیروت،تاریخ طبع ندارد)۹۰/۵۔شعرانی،عبدالوہاب بن احمد،کشف الغمہ،(مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ قاہرہ،۱۹۵۱ء)،۱۱۵/۱۔کاسانی،ابوبکر بن مسعود(الکتاب العربی بیروت،طبع دوم،۱۹۷۴ء)۳۸/۴۔(۵۳)القرآن الکریم:۲:۲۲۱۔ایضاً،۴:۲۵۔ایضاً،۲۴:۳۲۔اشرف الہدایہ،۱۶۰/۴۔زحیلی،وہبہ،الفقہ الاسلامی وادلتہ،۱۷۶/۷۔(۵۴)القرآن الکریم:۴:۲۵۔(۵۵)مودودی،تفہیم القرآن،۳۴۲/۱۔(۵۶)ابن ماجہ،السنن،۱۰۷/۱۔شوکانی،محمد بن علی،نیل اوطار،(ادارۃ القرآن کراچی،۱۹۸۷ء)۱۷۱/۵۔(۵۷)بخاری،الجامع الصحیح،ص۴۱۱،حدیث نمبر ۲۵۴۵۔(۵۸)الموسوعۃ الفقہیہ،۱۲/۲۳۔(۵۹)القرآن الکریم:۲:۱۷۸۔(۶۰)مالک،الموطا،ص۳۹۱۔(۶۱)دارقطنی،السنن،۱۶۴/۳۔(۶۲)محمد عبدالجواد محمد،التطور التشریعی فی المملکۃ العربیہ السعودیۃ،(مطبعہ جامعۃ القاہرہ والکتاب الجامعی قاہرہ،۱۹۷۷ء)ص۲۰۳۔(۶۳)القرآن الکریم:۹۰:۱۱-۱۳۔(۶۴)بخاری،الجامع الصحیح،ص۴۴۱،حدیث نمبر ۲۷۰۰۔(۶۵)القرآن الکریم:۷:۱۵۷۔(۶۶)ایضاً،۹:۱۱۱-۱۱۲۔(۶۷)بخاری،الجامع الصحیح،ص۴۱۲،حدیث نمبر ۲۵۵۲۔(۶۸)ڈاکٹر گستاؤلیبان،تمدن عرب،مترجم مولوی سید علی بلگرامی،(مقبول اکیڈمی لاہور،تاریخ طبع ندارد)،ص۴۸۸۔(۶۹)ایضاً،ص۵۱۷-۵۱۸۔(۷۰)الموسوعۃ الفقہیہ،۲۳:۱۲۔(۷۱)زحیلی،وہبہ،الفقہ الاسلامی وادلتہ،۲۵۸/۸۔

دکھنی اردو کا ایک غیر مطبوعہ مخطوطہ: خزانۂ عبادت

انوار صمدانی امروہوی

مخطوطات ہمارے شاندار ماضی اور روشن مستقبل کے ضامن ہیں۔ یہ ہماری ادبی، علمی و تاریخی وراثت ہیں۔ انہیں روشناس کرانا ہمارا فریضہ ہے۔ ان سطور میں دکھنی اردو میں لکھے گئے ایک غیر مطبوعہ قلمی، ادبی و فقہی مخطوطے کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ قبل ازیں مولف کے حالات پر سرسری نگاہ ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا۔

اس منظوم مخطوطے (۱) کا نام "خزانۂ عبادت" ہے اور اس کو نظم کا جامہ پہنانے والے سید شاہ محمد الحسینی چشتیؒ ہیں۔ تذکرہ اولیائے حیدرآباد مرتبہ سید مراد علی طالع (ج ۲، ص ۱۴۳) پر مرقوم ہیں:

"یہ بزرگ صحیح النسب ونجیب الطرفین (۲) سادات رضوی اور شیخ الوقت تھے۔ حضرت (شاہ محمد الحسینی چشتی) سید شاہ سہراب الدین چشتی عریاں شمشیر (م ۱۰۸۷ھ) کے حقیقی پوتے اور حضرت سید شاہ امین الدین علی چشتیؒ (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء) کے چھوٹے صاحبزادے تھے"۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے سید شاہ محمد الحسینی چشتی ابن سید شاہ امین الدین علی چشتی رضوی ابن سید شاہ سہراب الدین چشتی عریاں شمشیر رضوی ابن سید علی ابن سید ہاشم رضوی۔ (۳)

آپ صاحب علم اور نیک سیرت بزرگ تھے۔ نیز سلسلۂ چشتیہ، قادریہ میں اپنے والد گرامی سے شرف بیعت سے مشرف تھے۔ چنانچہ صاحب تذکرہ اولیائے حیدرآباد (ج ۲، ص ۱۴۳) پر رقم طراز ہیں:

> "شاہ صاحب اپنے وقت کے زبردست پیر طریقت اور ذاکر و مشاغل، نہایت متقی و پرہیزگار اور صاحب تسلیم و رضا، تہجد گذار اور پابند شریعت،

روم نمبر ۱۱۰، لوہیت ہوسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

صاحب تصرف اور بافیض صوفی تھے۔ مریدوں کی تعداد بھی بہت کافی تھی''۔

شاہ صاحب مخطوطے کے ورق ۱۳ات/ب پر اپنے مرشد کے بارے میں فرماتے ہیں:

ولیان سون ہی قایم زمانہ تمام — جکت جب تلک ہی وے ہی مدام
صدی باروین کے ولیا نمیں شکل — ولی ہینگے یو شاہ میران نول
کرامات ان کے بی بی سربسر — ہر یک ٹھور مشہور نکری نکر
میرے پیر کا طور یہی تھا تمام — کہ دریای وحدۃ میں غوطہ مدام
کہ جس کام خاطر جو آیا میرے پیر کے — بیان یرامت سویک دہیرتے
میں کرتا ہوں بوجو کہ ای خاص و عام — حضور یمیں تہا شیران کی مدام
تہجد کے وقت وظیفہ سینے — ادب سات آ بیٹھ کر سامنے

معلوم ہوا کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے علاوہ حضرت شاہ میران سے بھی بیعت تھے۔ شاہ میران بارہویں صدی ہجری کے بزرگوں میں سے تھے۔ جیسا کہ شاہ صاحب مخطوطے کے ورق ۱۳ات/ب پر فرماتے ہیں:

صدی باروین کے ولیا نمیں شکل — ولی ہینگے یو شاہ میران نول

شاہ صاحب اپنے بارے میں رقم طراز ہیں:

کرامت بہی بہوت ہی سر بسر — ولیکن مجی نین یہی فرست ککر
بیان اس کا مین نین کیا ہوں تمام — مجی ہی مسایل جو لکہنی کا کام

(مخطوطہ ورق ۱۳اث/ب)

آپ کا انتقال ۲۴/ماہ رمضان المبارک ۱۱۹۹ھ (۳۱/جولائی ۱۷۸۴ء بروز اتوار) ہوا اور محلہ لنگر حوض میں والد بزرگوار کے بائیں میں علاحدہ چوکھٹ میں دفن ہوئے۔ ہاتفی نامی شاعر نے آپ کے وصال پر فارسی زبان میں یہ اشعار کہے''۔ (تذکرہ اولیائے لاہور، ج ۲، ص ۱۴۴)

سلطان صابرین و یقین مصدر کرم — چو ارتحال کرد ازیں منزل عدم
چوں خاص دل ز روح مطہرش وفات — ازراہ لطف وجود بر ایں گشتہ رہبرم
ہاتف ز غیب گفت بجنت دوانہ شد — مسند نشین بملک جناں شاہ محمدم

''یک آفتاب رفتہ'' چنیں گفت ہاتفی تاریخ رحل ذات مبارک بہ مکترم

۱۱۹۹ھ

منقول از تذکرہ اولیائے حیدرآباد، مرتبہ سید مراد علی طالع، ج ۲، ص ۱۴۴۔

ہر سال ۲۴ / رمضان المبارک کو معمولی طور پر رسم فاتحہ خوانی کی جاتی ہے۔ (مذکور کتاب مرتبہ سید مراد علی طالع)

مخطوطے پر ایک نظر: نام خزانۂ عبادت، مولف سید شاہ محمد الحسینی چشتی، متوفی ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء۔ سنہ آغاز ۱۱۴۰ھ۔ سنہ اختتام ۱۱۹۹ھ۔ زبان دکھنی اردو، اوراق ۳۳۸ = ۶۷۶ صفحات۔ روشنائی سیاہ، شنگرفی۔ خط معمولی نستعلیق۔ کاغذ کا سائز 19.5x14.cm۔ حوض کا سائز 18.5x10.5cm۔ مخطوطہ کا نام اس شعر سے معلوم ہوتا ہے

کر بہوت رنج کہنج اسپر تمام ''خزانۂ عبادت'' رکھا اس کا نام

یہ مخطوطہ محمد علی بن حافظ عمر بن عوض بن محمد سعید باحضی کے پاس بھی رہا تھا۔ تعداد اشعار کم و بیش دس ہزار تریسٹھ ہے۔

خزانۂ عبادت کے ابھی تک صرف (علاوہ ازیں) دو ہی قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک سالار جنگ میوزیم حیدرآباد مکتوبہ (۱۲۴۱ھ)۔ دوسرا ادارۂ ادبیات اردو میں۔ (دیکھیے الموسیٰ کا یادگار ولی نمبر)۔ زیر نظر مخطوطہ تیسرا نسخہ ہے۔ نیز یہ نسخہ بدست مولف معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ مخطوطہ جگہ جگہ قلم زد اور مولف نے اس کی جگہ دوسری عبارت بین السطور اور حاشیے میں لکھی ہے۔ اس میں دو روشنائیاں سیاہ روشنائی متن میں اور شنگرفی سرخیوں کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

مولف کو اردو، عربی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل ہے۔ اس کتاب میں جہاں اردو (دکھنی) اشعار موجود ہیں وہیں عربی اشعار یا الفاظ بھی ہیں۔ ورق ۸۷ / ب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ریاح رشاد بہی راسم و رعیل فضات فیاض بہی فاکل فبیل

عیال عیان بہی عزرون بہی عرسین و علام و عزنون بہی

مولف شاہ محمد الحسینی خلفائے راشدین کی مدح سرائی اس طرح فرماتے ہیں:

۱ دعا مانگنے کے سو بہیٔ بعد از امام مراتب ابابکرؓ کا پر تمام
۲ دعا مانگنے کے سو بہی بعد ازان مراتب عمرؓ کا سو پر ناہی یان
۳ دعا کے پیر و بعد یکبار یون مراتب یو عثمانؓ جون ہی بتون
۴ دعا کے پچہی پہر کو فی الفور توں علیؓ کا مراتب پیر اسطور سون

شاہ محمد الحسینی صاحب امام سیف الدینؒ کے لیے (ورق ۱۰۰/الف) فرماتے ہیں:

کہی خواجہ امام سیف الدین غزنوی موذن کہی سو کہی سب وہی
ثلثہ کہی تو سنو ای عزیز امام اعظم یوسف محمد سو تمیز

احمد شاہ غازی دکنی کی مدح اس طرح کرتے ہیں:

بعد اس کے دسری سپری پواتر صفت بادشاہ کے سو کرنے سکر
یو یعنے جو جس کے سو شاہی اچھی ضرور یکون اتناج پر ناہکی

اللہم وفق سلطان زماننا ہذا احمد شاہ بادشاہ غازی لما تحب وترضی واجعل اخر خیر من الاولے.........

زمانے میں احمد شاہ کے تمام بنیا کو اسمین لکھیا ان کا نام (ورق ۱۸۹/الف/ب)

علاوہ ازیں شاہ محمد الحسینی صاحب بزرگان دین وعلماء متین مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ محمد طاہرؒ، امام سیوطیؒ، ابن ہمام، امام فخر الدین رازیؒ، ملاعلی قاری اور ائمہ اربعہ کی مدح سرائی کی ہے۔ نیز دکھن کے لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

دکھن کے اچھن لوک تو یوں جوکئی نماز پوجو اس وقت کا فرض ہے
سو کرتاؤں خدا واسطا سربسر بعد بوے اللہ اکبر کسکر (ورق ۱۵۵/ب)

شاہ صاحب نے جن کتب سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

بہی یہی نیک عمل جو او میوہ سوجان کتابان مینے معتبر یو بیان (ورق ۱۲/ب)

مخطوطے کا نام اس شعر سے معلوم ہوتا ہے:

''خزانۂ عبادت'' رکھا اس کا نام (ورق ۱۴/الف)

شاہ محمد الحسینی نے جن مذہبی کتب سے استفادہ کیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں:

۱۔تفسیر معانی، ۲۔ جامع الرموز، ۳۔فتاویٰ جمادی، ۴۔فتاویٰ شافی، ۵۔فتاویٰ الاسرار، ۶۔فتاویٰ غرائب، ۷۔فتاویٰ قراخانی: (۴) مولانا امام صدر الملت والدین یعقوب مظفر کرمانی، ۸۔ فتاوی سمرقندی: ابو القاسم ناصر الدین محمد بن یوسف سمرقندی حنفی ۵۵۶ھ، ۹۔فتاوی ظہیریہ: شیخ ابوبکر ظہیر الدین محمد بن احمد بخاری حنفی م ۶۱۹ھ، (برصغیر میں علم فقہ، ص ۱۰۲)، ۱۰۔فتاوی عتابی رجامع الفقہ: ابونصر احمد بن عمر زاہدی عتابی تجاری م ۵۸۶ھ (برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۷۲، اسحاق بھٹی)، ۱۱۔فتاوی قاضی خان: (۵) فخر الدین حسن بن منصور حنفی م ۵۹۲ھ ۱۰۲/ قاموس المشاہیر، ص ۱۰۲، ۱۲۔فتاوی حجت، ۱۳۔فتاوی محمودی، ۱۴۔فتاوی جواہر رجواہر الفتاویٰ: شیخ رکن الدین ابوبکر محمد بن المفاخر بن عبد الرشید کرمانی حنفی (برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۶۸)، ۱۵۔فتاوی عالمگیری ۱۰۶۷ھ میں تالیف ہوا، ۱۶۔فتاوی کبیر، ۱۷۔فتاوی برہنہ، ۸۔فتاوی جلالی، ۱۹۔فتاوی قادریہ، ۲۰۔فتاوی حمادیہ: نویں صدی ہجری کی تصنیف ہے جو کہ گجرات کے قاضی القضاۃ حماد الدین کی طرف منسوب ہے۔اس فتاوی کو بحکم قاضی حماد الدین، قاضی رکن الدین اور ان کے صاحبزادے قاضی داؤد ناگوری نے مرتب کیا تھا (برصغیر میں علم فقہ، ص ۱۲۹)، ۲۱۔فتاوی غیاثیہ: سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں لکھا گیا، م ۶۶۴ تا ۶۸۶ھ/ ۱۲۶۶ تا ۱۲۸۷ء، ۲۲۔فتاوی حمیدیہ، ۲۳۔فتاوی بحر الرائق، ۲۴۔فتاوی جامع العصر، ۲۵۔فتاوی حجج، ۲۶۔فتاوی ابواللیث: نصر بن سمرقندی امام ابواللیث م ۳۷۳ھ (قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون، ص ۱۰۲)، ۲۷۔جامع الفتاوی: ابوالقاسم ناصر الدین محمد بن یوسف سمرقندی حنفی ۵۵۶ھ، ۲۸۔نوادر الفتاوی: شیخ ابوسلمان موسیٰ بن سلیمان جوز جانی بغدادی حنفی م ۲۰۰ھ (برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۷۸)، ۲۹۔مجموع سلطانی رمجموعہ سلطانی مشائخین دربار محمود غزنوی (فہرست مخطوطات شیرانی، ج ۳، ص ۲۰۲)، ۳۰۔مختار الفتاوی: از صاحب ہدایہ (ظفر المحصلین، ص ۱۹۴)، ۳۱۔شرح وقایہ: عبید اللہ صدر الشریعہ الاصغر ص ۷۴۷ھ (ظفر المحصلین، ص ۲۰۵)، ۳۲۔فتح القدیر: قاضی القضاۃ ابوعلی غنی بن علی شوکانی (از تاریخ احمد، ص ۷)، ۳۳۔ہدایہ: ابوالحسن علی بن ابی بکر پیدائش ۸/ رجب ۵۱۱ م ۵۹۳ یا ۵۹۶ھ، ۳۴۔بخاری شریف: حضرت امام بخاریؒ ۲۵۶ھ، ۳۵۔نسائی شریف: ابوعبد الرحمٰن شعیب بن علی نسائیؒ پ ۲۱۵ھ، م ۳۰۳ھ (ایک عالمی تاریخ، ص ۷۷)،

۳۶۔ ابوداؤد شریف: ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی پ ۲۰۲ھ، م ۲۷۵ھ (ایضاً)، ۳۷۔ ابن ماجہ شریف: ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی پ ۲۰۹ھ، م ۲۷۳ھ (ایضاً)، ۳۸۔ مسلم شریف: حضرت امام مسلمؒ پ ۲۰۶ھ، م ۲۶۱ھ (ایضاً)، ۳۹۔ مختصر القدوری: ابوالحسین احمد قدوری پ ۳۶۲م، ۵ رجب ۴۲۸ھ مذکورہ کتاب، ص ۸۸-۱۸۹ (۲)، ۴۰۔ شرح مسند: شیخ نورالدین علی القاری الہروی م ۱۰۱۴ (ظفر المحصلین، ص ۴۸۴)، ۴۱۔ شرح التنبیہ: محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف بن حسن نوادی م ۶۷۷ھ مذکورہ کتاب ص ۷۵-۴۷۴، ۴۲۔ شرالمنیہ، ۴۳۔ شرح منظومہ، ۴۴۔ (رسالہ) شرح نام حق، متن کے مصنف علمائے بلخ میں سے ہیں۔ (فہرست کتب خانہ پشاور نمبر ۶۲۰)، ۴۵۔ شافیعہ رشافیہ از ابن حاجب، ۴۶۔ منیۃ المصلی وغنیۃ المبتدی، ۴۷۔ جامع الکبیر، ۴۸۔ خلاصۃ الاحکام، ۴۹۔ جامع الصغیر: محمد ابوعبداللہ پ ۱۳۲ھ، م ۱۸۹ھ (ظفر المحصلین، ص ۹۱)، ۵۰۔ صلوۃ المسعودی: شیخ ابوعطا مسعود بن محمود بن یوسف سمرقندی، ۵۱۔ رسالہ لباس: قاضی اختیار صاحب (اس مخطوطہ میں یہ نام لکھا ہوا ہے)، ۵۲۔ خلاصۃ الفقہ: شیخ طاہر بن احمد بخاری م ۵۴۲ھ، ۵۳۔ تجسس المزید: ابوطاہر محمد بن محمد عبدالرشید م ۴۷۷ھ (ظفر المحصلین، ص ۶۱۹)، ۵۴۔ تحفۃ النصائح: شیخ یوسف دہلوی خلیفہ چراغ دہلیؒ، ۵۵۔ زادالفقہاء، ۵۶۔ محیط میانی (معانی)، ۵۷۔ مصفی، ۵۸۔ ینابیع الاحکام: امام عبداللہ محمد بن ژنگی السفرائنی الشعمی الساوی (برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۸۰)، ۵۹۔ خزانۃ الروایہ، ۶۰۔ صحیح ظہیری، ۶۱۔ قنیہ: نجم الدین مختار بن محمود الزاہدی م ۶۵۸ھ (کتب خانہ پشاور نمبر ۶۱۸)، ۶۲۔ الکافی: شیخ موفق الدین عبداللہ بن احمد مقدسی م ۶۲۰ھ (ایک عالمی تاریخ، ص ۸۰)، ۶۳۔ ترغیب الصلوۃ: محمد بن احمد زاہد (کتب خانہ پشاور نمبر ۶۵۱)، ۶۴۔ نصاب الفقہ: شیخ طاہر بن احمد بخاری م ۵۴۲ھ (برضغیر میں علم فقہ، ص ۳۷۸)، ۶۵۔ ابن زیاد، ۶۶۔ درہم الکیس، ۶۷۔ محبّ الاتقیاء، ۶۸۔ تیسیر الاحکام: شہاب الدین بن شمس الدین عمر الذاولی الدولت آبادی م ۸۴۸ھ (فہرست رام پور عربی اول ۱۱۴)، ۶۹۔ کفایہ: قاضی ابوعلی محمد بن محمد بن حسین بن الضراء حنبلی م ۴۵۸ھ (قرۃ العیون، ص ۸۹)، ۷۰۔ تکمیل الایمان: شیخ عبدالحق محدث دہلوی م ۹۵۸ھ (فہرست مخطوطات شیرانی، ج ۲، ص ۲۷۸)، ۷۱۔ مراج الوہاج، ۷۲۔ نصاب الصبیان: ابونصر راہی، ۷۳۔ الملتقط: امام ناصرالدین

ابوالقاسم محمد بن یوسف حسینی سمرقندی ۵۵۶ھ (کتب خانہ پشاور نمبر ۶۹۹)، ۷۴۔ تحفۃ الفقہاء: شیخ علاء الدین محمد بن احمد حنفی سمرقندی (برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۶۷، مزمل لائبریری، ص ۳۲۸)، ۷۵۔ زینت القاری: کرامت علی جون پوری ۱۲۹۰ھ (تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۹۶)، ۷۶۔ عمدۃ الاسلام: ابوطالب بن کمال ملتانی (فہرست رضا لائبریری رام پور، ج ۱)، ۷۷۔ سراجیہ: ابوطاہر محمد سراج الدین بن محمد بن عبدالرشید (ظفر المحصلین، ص ۲۱۹)، ۷۸۔ نورالایضاح: ابوالاخلاص حسن بن عمار بن علی ۹۹۹م، ۱۱ر رمضان ۱۰۶۹ھ (ظفر المحصلین، ص ۲۰۹)، ۷۹۔ غنیت الطالبین: امام الاولیاء سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی نوراللہ مرقدہ، ۸۰۔ خلاصۂ کیدانی: شمس الدین محمد بن حمزہ الفندی بقول بعض لطف اللہ السفی المعروف بالفاضل الکیدانی م ۵۳۴ھ (فہرست نسخہ ہای خطی فارسی رام پور رضا لائبریری، ج ۱، ص ۱۱۵)، ۸۱۔ جواہر خمسہ: سیدنا محمد غوث گوالیاریؒ، ۸۲۔ تحفۃ الملوک: ابواسماعیل خواجہ عبداللہ بن محمد انصاری ہروی م ۴۸۱ھ (فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، ج ۱، ص ۵۴۰)، ۸۳۔ قدوری: پ ۳۲ھ م بہ عمر ۶۶ سال بروز اتوار ۵ر رجب ۴۲۸ھ (ظفر المحصلین، ص ۱۸۹)، ۸۴۔ خزانۃ المتقین: شیخ حسین بن محمد سیقانی (سمنقانی) حنفی م ۷۴۰ھ (برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۶۹)، ۸۵۔ مفید الاولیاء: داراشکوہ ۱۰۶۹ھ، ۸۶۔ میزان الشعراء، ۸۷۔ قواعد سرجی، ۸۸۔ تفسیر بحر العلوم، ۸۹۔ منہاجیہ، ۹۰۔ بدایع محیط، ۹۱۔ صدر الشریعہ، ۹۲۔ نسفی، ۹۳۔ فتح المعین، ۹۴۔ صاجیہ، ۹۵۔ شتابی، ۹۶۔ والجیہ، ۹۷۔ طیبی شرح مرقاۃ: حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی م ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء (فہرست کتب خانہ پشاور نمبر ۳۲۷)، ۹۸۔ فقہ ابوجعفر: ابوجعفر محمد بن طبر یزطبری م ۲۱۰ھ (قرۃ العیون، ص ۱۵۸)۔

خزانہ عبادت کی فہرست ابواب وعناوین ملاحظہ فرمائیں:

نمبر	باب/مضمون	ورق	نمبر	باب/مضمون	ورق
۱	ثنائے باری تعالیٰ	۱	۵	فرض کرا گویند	۱۳
۲	وصف محمد ﷺ		۶	واجب کرا گویند	۱۴
۳	منقبت صحابہؓ		۷	سنت کرا گویند	۱۴
۴	تعریف پیر خود	۱۰	۸	مستحب کرا گویند	۱۴

شاہ محمد الحسینی صاحب نے تمام کتب کا ذکر شاعری میں کیا ہے۔ مثلاً بحر الرائق، بحر المذاہب وغیرہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں بحر الرائق سوحنفیہ کتاب، بحر المذاہب سو شافعہ کتاب (مخطوطہ ورق ۵۹/الف)، مفاتیع (مفاتیح) کے بیچ دیکھاہوں میں ندیناام وولد خواجہ کے تین (ورق ۲۷/ب)۔

اسی طرح شاہ محمد الحسینی صاحب نے قرآن کریم واحادیث مبارکہ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہ مخطوطہ دکھنی اردو ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔ نیز یہ نسخہ مولف کے مزید حالات، مذہب اور اس وقت رائج شدہ اردو الفاظ پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

حوالے

(۱) یہ مخطوطہ میرے برادر بزرگ جناب افتخار احمد جیلانی نے حیدرآباد سے خریدا تھا۔ آپ ہندوستان کے معروف ماہر نوادرات جناب توفیق احمد قادری چشتی امروہوی کے لائق مند پسر ہیں۔ اب یہ نسخہ جناب مفتی محمد شاہد مدظلہ العالی نواسہ مولانا محمد زکریاؒ صاحب کی کوشش سے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ (۲) ''نجیب الطرفین کی اصطلاح نہایت غیر اسلامی غیر انسانی اور غیر ضروری ہے، جس پر فخر کرنا یا زور دینا منطقی طور پر مناسب نہیں معلوم ہوتا''۔ گفتنی ناگفتنی مصنف وامق جون پوری متوفی ۲۱/نومبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۔ (۳) محبوب ذوالمنن فی تذکرہ اولیائے دکن، ج ۱، ص ۳۹۸۔ (۴و۵) لیکن قاموس المشاہیر جلد دوم کے مرتب نے اس کا نام قرآن خانی لکھا ہے جو بہ عہد علاء الدین خلجی ہوا ہے۔ (۶) برصغیر پاک وہند میں علم فقہ از مولانا محمد اسحاق بھٹی، ص ۳۴۔

مآخذ

۱۔ تذکرہ علمائے ہند از رحمٰن علی ترجمہ محمد ایوب قادری مطبوعہ ۱۹۶۱ء۔ ۲۔ فہرست کتب خانہ پشاور۔
۳۔ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی رضا لائبریری رام پور یوپی، اول، دوم۔
۴۔ فہرست مخطوطات مزمل لائبریری علی گڑھ۔ ۵۔ قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون از مولانا ظفر صاحب گنگوہی۔
۶۔ ظفر المحصلین از مولانا ظفر صاحب گنگوہی۔ ۷۔ تذکرہ اولیائے حیدرآباد جلد دوم مرتبہ سید محمد مراد طالع۔
۸۔ محبوب ذوالمنن فی تذکرہ اولیائے دکن جلد اول۔ ۹۔ فہرست مخطوطات شیرانی اول تا سوم۔
۱۰۔ برصغیر پاک وہند میں علم فقہ از محمد اسحاق بھٹی۔ (پاکستان)
۱۱۔ ایک عالمی تاریخ از مولانا محمد عثمان معروفی مطبوعہ ۱۹۷۳ء۔
۱۲۔ گفتنی ناگفتنی از وامق جونپوری م ۲۱/نومبر ۱۹۹۸ء۔
۱۳۔ وفیات مشاہیر اردو از محمد بشارت علی خاں فراغ م ۱۳/فروری ۲۰۱۰ء۔

کلام اقبال میں عربی زبان وادب اور ثقافت کے اثرات
ایک تاثر

پروفیسر صلاح الدین ندوی ازہری

راقم نے الازہر یونیورسٹی قاہرہ میں تقریباً پندرہ سال کا طویل عرصہ علامہ اقبال پر D.Lit کرنے اور تعلیم وتعلم میں گذارا ہے اوراس وقت ملایا یونیورسٹی سے وابستہ ہے، مولوی سعید الظفر ندوی کا تعلق ہندوستان سے ہے۔انہوں نے کلام اقبال میں عربی زبان وادب اور ثقافت کے اثرات کے موضوع پر عربی زبان میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا اور خواہش کی کہ اس پر ناچیز اپنی رائے تحریر کرے۔

علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت کا تعارف ان کے کلام کی روشنی میں عربی زبان میں کرانے کی کوشش قابل قدر ہے اور معارف سے علامہ اقبال کا رشتہ پرانا ہے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ قارئین معارف کے سامنے اس عربی مقالہ کا تعارفی خاکہ اور تاثر پیش کردیا جائے۔

یہ مقالہ مقدمہ کے ساتھ چھ ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے:

باب اول کی پہلی فصل میں مقالہ نگار نے شاعر کے عہد کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، سکونت اور استحکام کا پس منظر پیش کیا ہے اور اسی باب کی دوسری فصل میں ان عوامل پر روشنی ڈالی ہے جو علامہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما تھے۔باب دوئم کی پہلی فصل میں شاعر کی انقلاب آفریں زندگی، شجرۂ نسب، نشوونما، تعلیم وتربیت اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کے سفر کا ذکر ہے، جس کا اقبال کے فکر ووجدان اور شاعری پر گہرا اثر پڑا ہے، اسی باب کی دوسری فصل میں ان کی شاعری کی ابتداء اور بہ تدریج فکری ولسانی تبدیلی کے ساتھ اس کے ارتقاء

ڈائریکٹر شعبہ سائنٹیفک ریسرچ، ملایا یونیورسٹی، ملیشیا۔

کا ذکر ہے۔ باب سوم میں علامہ کے فارسی اور اردو دواوین کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز علامہ کے ان شعری و نثری ذخیروں کو بھی موضوع بحث و تحقیق بنایا گیا ہے جنہیں دواوین کے صفحات میں جگہ نہ مل سکی یا جو نثری شکل میں تھے یا تصانیف کا وہ خاکہ جو مرحوم کے ذہن میں تھا لیکن وہ معرض وجود میں نہ آسکا۔ یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔

باب چہارم جو مقالہ کا سب سے اہم حصہ ہے یعنی کلام اقبال میں عربی زبان و ادب اور ثقافت کے اثرات۔ اسے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اول میں شاعر مشرق کے عربی زبان سے گہرے تعلق و تبحر اور قدرت کو اجاگر کیا گیا ہے جب کہ دوسری فصل میں کلام اقبال میں قرآن حکیم کے اثرات کو اور چوتھی میں عربی زبان و ادب اور ثقافت کے اثرات کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں ان عرب شخصیات کا ذکر ہے جنہیں علامہ نے اپنے کلام میں مثالی اور لائق اتباع گردانا ہے اور ان کے روشن کارناموں سے درس حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس باب کی پہلی فصل انبیاء و رسل پر مشتمل ہے جب کہ فصل دوئم رسول عربی کے جاں نثار صحابہ اور تیسری فصل تابعین، تبع تابعین اور اسلاف امت پر مشتمل ہے۔

باب ششم میں اس سرزمین عرب کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس کی خاک کو اقبال اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے پر فخر کرتے ہیں۔

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ　　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اس میں حجاز مقدس کے ساتھ عرب کے دوسرے علاقوں بالخصوص فلسطین کا ذکر بہ کثرت موجود ہے، آخر میں پورے مقالہ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ بڑی سائز کے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

جہاں تک علامہ کے اردو، فارسی اشعار کے عربی ترجمے کا تعلق ہے فاضل مقالہ نگار کی عرق ریزی اور دیانت نمایاں ہے۔ ترجمہ ایک فن ہے جو مہارت اور تجربہ کا متقاضی ہے۔ انہوں نے اس فن میں اپنی صلاحیت اور قابلیت ثابت کی ہے۔ انہیں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ علامہ اقبال پر کام کرنے کے لیے تینوں زبانوں پر قدرت

رکھنا ضروری ہے۔عربی ادب وثقافت سے مصنف کا گہرا شغف مقالہ میں صاف ظاہر ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کلام اقبال میں عربی زبان وادب اور ثقافتی اثرات کی تلاش میں عرق ریزی سے کام لیا ہے،مقالہ میں جگہ جگہ قدیم وجدید عربی ادب کے مصادر اور دور جاہلیت کے فصیح و بلیغ شعراء کے دواوین کے حوالہ جات بھی موجود ہیں۔مقالہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں عربی علوم وفنون کے عروج کا پس منظر بھی ہے۔عربی کے علاوہ فارسی زبان کی باریکیوں کا نمایاں طور پر مصنف نے اپنے مقالہ میں احاطہ کیا ہے۔چنانچہ علامہ کے فارسی کلام کی عربی ترجمانی میں ان کا فارسی ذوق نمایاں ہے۔

مختصر یہ کہ مقالہ عربی دانوں کے لیے ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے جو قیمتی علمی مواد فراہم کرتا ہے مقالہ نگار نے علامہ اقبال کی شخصیت کا مختلف جہتوں سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عربی زبان میں ایسا دقیق علمی مقالہ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیوں میں کم دیکھنے کو ملے گا۔انہوں نے اس مقالہ کے ذریعہ ہندوستانی ثقافت وادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اخبار علمیہ

پاکستانی دستور کی دفعہ ۶۲ میں صراحت ہے کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو اسلامی تعلیمات وفرائض سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے لیکن پچھلے دنوں کابینی اجلاس کے دوران سورۂ اخلاص کی متعدد بار غلط تلاوت سے وہاں کے وزیر داخلہ کے خلاف عدالت عظمیٰ میں مقدمہ دائر کیا گیا ہے، طارق اسد نامی وکیل نے اپنی درخواست میں کہا ہے کہ موجودہ وزیر داخلہ چونکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ناواقف ہیں، سورۂ اخلاص کی غلط تلاوت اس کا ثبوت ہے، لہٰذا انہیں پارلیمنٹ کے لیے نااہل قرار دیا جائے، اس استغاثہ پر عدالت عظمیٰ وزارت عظمیٰ کو وزیر داخلہ کو پارلیمنٹ سے علاحدہ کرنے کا حکم دے سکتی ہے، جب اس سلسلہ میں وزیر داخلہ رحمٰن ملک سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے معاون عہدے داروں نے انہیں غلط طباعت والا نسخہ دے دیا تھا، یہ خبر پاکستان کے الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں پچھلے دنوں چھائی رہی۔

''صراط مستقیم''، برمنگھم کی خبر کے مطابق یورپ میں عوامی سطح پر ایک سروے کرایا گیا جس میں سوال تھا کہ امن عالم کے لیے صدام حسین، امریکہ اور اسرائیل میں سب سے زیادہ خطرناک کون ہے؟ تو ۵۹ فیصد افراد نے اسرائیل کو سب سے زیادہ خطرناک اور امن عالم کے لیے مہلک بتایا، اسرائیل سے شائع ہونے والے ایک معروف اخبار ''بدیعوت اجروتوت'' نے اس کے ردعمل کے طور پر ایک تہدید آمیز اور قابل توجہ تبصرہ یہ کیا کہ اس جائزہ رپورٹ کی اشاعت سے مسلمان یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے بہت بڑا میدان فتح کرلیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے بڑے ممالک برطانیہ، اٹلی، روس اور ان کے علاوہ ہندوستان، چین اور اسپین وغیرہ عربوں کے بالمقابل اسرائیل کے حلیف ہیں، فرانس واحد ملک ہے جو عربوں کا ساتھ دے گا، وہ بھی پورے طور پر نہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ اسرائیل وہ ملک ہے جس کی مٹھی میں عالمی اقتصادیات اور دنیا کے دس ذرائع ابلاغ ہیں، اسرائیل جب چاہے مسلمانوں کی مٹی پلید کرسکتا ہے اور یہ اس کا کچھ بھی بال بیکا نہیں کرسکتے، عالم اسلام کو چاہیے کہ اسرائیل کی مخالفت ترک کرکے اس سے دوستی اور خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے معاہدہ پر دستخط کردے، اس کے بعد اسرائیل دنیا کے سامنے مسلمانوں کو

روسیاہی اور بدنامی سے بچا سکتا ہے اور انہیں دنیا میں امن، چین اور سکون حاصل ہوسکتا ہے۔

منصف، حیدرآباد کی اطلاع ہے کہ قطر میں مقیم مشہور تاجر اور سماجی خدمات کے لیے پدم شری اور دوسرے ایوارڈ سے سرفراز چریل کرشنا مینن کیرالا کے شہر کوزی کوڈ میں مسجد تیار کرار ہے ہیں، اس میں چار سو مصلیوں کی گنجائش ہوگی اور جو آیندہ دو تین ماہ میں تکمیل کے مراحل طے کرلے گی، رپورٹ کے مطابق کیرالا میں کسی ہندو کی جانب سے یہ پہلی مسجد ہوگی، اس کی تعمیر کے لیے انہوں نے پہلے ہی مفتیان کرام سے استفتاء کرلیا تھا جس میں انہیں منظوری دی گئی تھی، مینن کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں چیرا حکمراں راما ورما کولا شیکھر نے چیرامن میں مسجد بنوایا تھا، انہوں نے مزید کہا کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، باہمی اتحاد، قومی یکجہتی اور تمام بڑے مذاہب کے فروغ کے لیے اس قسم کے کام کرتے رہیں گے، بھگوت گیتا سے واقفیت کے دائرہ کو بڑھانے کے مقصد سے وہ تراونتا پور میں ایک دارالمطالعہ قائم کرنے والے ہیں اور کیرالا میں ایک چرچ کے قیام کا بھی ان کا ارادہ ہے۔

جینیاتی اعتبار سے ترمیم شدہ اشیائے خوردنی وہ ہیں جن میں جینیاتی ترمیم کی جاسکتی ہے، ترمیم شدہ آرگنزم وہ ہیں جن کا جینیاتی مواد (ڈی این اے) دوبارہ جڑنے والے ڈی این اے ٹکنالوجی کے ذریعہ بدل دیا گیا ہو۔ اس عمل سے ترمیم شدہ اشیائے خوردنی میں مخصوص پسندیدہ خصوصیت پیدا ہوتی ہے مثلاً اس عمل سے انہیں کیڑوں کے اثر سے بچایا جاسکتا ہے، ان میں غذائی اور طول عمری کی شرح بڑھائی جاسکتی ہے، منتخب کردہ انفرادی جینز کو ایک آرگنزم سے دوسرے آرگنزم میں بدلا جاسکتا ہے یہاں تک کہ غیر متعلق قسموں یا ذاتوں کے درمیان بھی جن اشیائے خوردنی میں اب تک دنیا نے تجربہ کیا ہے ان میں ٹماٹر، سویابین، مکئی، کپاس، بیگن، چاول اور چقندر وغیرہ ہیں۔ مفصل تحقیق یوجنا، جنوری میں شائع ہوئی ہے۔

ہارپ ٹکنالوجی یعنی برقی مقناطیسی لہر کے ذریعہ دنیا کے کسی خطہ میں بھی سیلاب، خشک سالی اور زلزلہ پیدا کیا جاسکتا ہے، یہ ٹکنالوجی اس قدر خطرناک ہے کہ زمین کی اپنی مقناطیسی فیلڈ (میدان) کے بہ نسبت ساٹھ ہزار گنا زیادہ مقناطیسی فیلڈ پیدا کرسکتی ہے، رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر رویسل

برٹیل بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنفہ اور سائنسداں اپنی کتاب "Earth the Latest Weapon of Planet" میں ہارپ ٹکنالوجی کے متعلق لکھتی ہیں کہ ہارپ فوجی تنصیبات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو انتہائی حیران کن حد تک طاقتور ہے، اس سے مختلف قسم کے برقی مقناطیسی میدان اور طویل موجیں پیدا کی جاسکتی ہیں، جن میں سے ہر ایک کی زمین اور اس کے ماحول کو متاثر کرنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے، ہارپ کا برقی مقناطیسی میدان زمین کے اپنے میدان سے ساٹھ ہزار گنا زیادہ طاقتور ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ بعض ماہرین نے ۲۰۰۸ء میں چین کے صوبہ سچوان، ہیٹی اور ایران میں آنے والے زلزلوں اور سنامی طوفان کے پیچھے ہارپ ٹکنالوجی کے استعمال کی جانب اشارہ کیا ہے کیونکہ صوبہ سچوان کے زلزلہ میں چین کی سب سے بڑی فوجی اور نیوکلیر تنصیبات تباہ ہوئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ چین نے ابتدائی طور پر بین الاقوامی امداد لینے سے انکار کردیا تھا اور ۷۲ گھنٹے بعد بین الاقوامی اداروں کو متاثرہ مقام پر جانے کی اجازت دی گئی تھی۔

وزارت اقلیتی امور اور منصوبہ بندی کمیشن کے سینئر عہدے داروں کے نئی دہلی میں اجلاس کے متعلق جو رپورٹیں اخبارات میں آئی ہیں وہ یقیناً اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے حق میں خوش آیند ہیں، مسلمانوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے طریقۂ کار اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے اجلاس میں متعدد تجاویز پیش کی گئیں، شرکائے اجلاس نے اس بات پر زور دیا کہ اقلیتوں کے لیے اسکالرشپ کی اسکیمیں ایس سی، ایس ٹیز کے مساوی ہونی چاہئیں، فلاحی بجٹ میں گیارہویں بجٹ سے کم از کم دس گنا زیادہ اضافہ ہونا چاہیے اور ان تمام منصوبوں پر عمل آوری کی تمام تر ذمہ داری اقلیتی وزارت کے سپرد کی جائے اور ہر سطح پر مسلم اقلیت کے سرگرم رول کو یقینی بنایا جائے۔

کویت پارلیمنٹ کے تیس ارکان نے اس بل کی حمایت کی ہے جس کے رو سے فوجیوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت ہوگی، جب کہ ۸ ارکان نے اس کی مخالفت کی ہے، گذشتہ سال پہلی بار منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں جانے والی چار عورتوں میں تین نے حمایت اور ایک نے رائے دہی سے احتراز کیا ہے۔

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

ماہنامہ افکار ملی (خصوصی شمارہ سیرت محمد ﷺ اور عصر حاضر): مدیر ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۲۴۰، قیمت سالانہ ۲۰۰ روپے، خصوصی شمارہ ۱۰۰ روپے، پتہ: دفتر ۹ / ۶۳۴، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

آج ساری دنیا میں سائنس وٹکنالوجی میں روز افزوں ترقی ہورہی ہے، انسان نئے نئے وسائل اور آلات آرام وتعیش سے روشناس ہورہا ہے، مال ودولت کی فراوانی اور اسے پوشیدہ ذخائر قدرت پر دسترس حاصل ہورہی ہے، اس کے باوجود ہر چہار جانب ظلم وزیادتی کا بازار گرم ہے بے راہ روی عام ہے، مادہ پرستی اور خود غرضی رگوں تک پہنچ گئی ہے، عدل وانصاف عام لوگوں کے لیے محض کتابی شئی بن کر رہ گئی ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ان مسائل کو کیسے حل کیا جائے اور دور حاضر کے تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے انسانی معاشرہ کو تباہی سے کیسے بچایا جائے، کیا کوئی اصول اور اسوہ ایسا ہے جو ان تمام مسائل کو حل کرسکتا ہے، یہاں ہم کہہ سکتے ہیں اور فخریہ کہہ سکتے ہیں اور ہر انصاف پسند تاریخ کا مطالعہ کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ ہاں ایک مذہب اور شخصیت ایسی ہے جس کے بتائے ہوئے طور طریقوں کو ہم مشعل راہ بنا کر انسانی معاشرے اور تمدن کو پاک وصاف بنا سکتے ہیں اور اسے راہ راست پر گامزن کرسکتے ہیں اور وہ اصول وقواعد زندگی اسلام کا دستور ہے اور رحمت للعٰلمین کی دکھائی ہوئی راہ ہے۔

زیر نظر خصوصی شمارہ غالباً ان ہی مسائل کو دیکھتے ہوئے شائع کرنے کا ارادہ کیا گیا، جس کا عنوان ''سیرت محمدؐ اور عصر حاضر'' ہے، نبی کریمؐ کی بعثت سارے جہاں کے لیے باعث رحمت ہے، آپؐ کی حیات مبارک کے مختلف گوشے انسانی زندگی کے لیے بہترین نمونہ ہے، آپؐ

کا لایا ہوا دین "اسلام" خالق کائنات کا عطا کردہ ہے، آپؐ کی سیرت طیبہ پر عمل پیرا ہونے میں دور حاضر کی تمام پریشانیوں، تمام آلام و مصائب اور تمام مسائل کے حل کا راز پوشیدہ ہے۔ اس خصوصی اشاعت میں پچاس سے زائد مضامین نو ابواب کے تحت جمع کیے گئے ہیں، ان نو گوشوں کو عصر حاضر، شخصی ارتقاء، طرز زندگی (لائف اسٹائل)، سماج کے کمزور طبقات، سیرت نبویؐ اور عالمی مسائل، شعبہ ہائے زندگی میں سیرت نبویؐ کی رہنمائی، مسلمانان عالم کے مسائل، تمدنی مسائل وغیرہ اور سیرت سرور عالمؐ جیسے گونا گوں اور اہم مباحث میں تقسیم کرکے دور جدید کی دشواریوں، عدم توازن، انسانی صحت کو لاحق جدید خطرات، خواتین کو درپیش مسائل، کمزور طبقات بالخصوص مزدوروں، مجبوروں اور معذوروں کے مسائل اور سماجی و معاشی استحصال، عدم مساوات اور روحانی کرب و اضطراب، جنگ، غارت گری اور موجودہ دور کے انسانی معاشرے کے دیگر مسائل و مصائب سے نجات کی واحد صورت اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے کامل اسوہ اور لائق تقلید نمونہ میں بتائی گئی ہے، مولانا سید اسعد گیلانی، مولانا ظفر اللہ بیگ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا نظام الدین اصلاحی، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، عبداللہ جاوید، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر غطریف شہباز اور دیگر مضمون نگاروں کی تحریریں پرمغز اور دلکش ہیں، رسالہ پراز معلومات اور کارآمد ہے، ادارہ اس مبارک اشاعت اور نیک مقصد کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے۔

ماہنامہ بانگ حراء (خصوصی اشاعت مولانا حافظ محبوب الرحمٰن ازہری):

مدیر مولانا محمد عبدالرشید ندوی، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۸، قیمت خصوصی شمارہ ۶۰ روپے، سالانہ اندرون ملک ۱۵۰ روپے، بیرون ممالک فضائی ڈاک ۱۲۵ امریکی ڈالر، نیپال، بنگلہ دیش، پاکستان فضائی ڈاک ۶۰۰ روپے، پتہ: بانگ حراء شہاب بلڈنگ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ-۲۰۔

مولانا محبوب الرحمٰن ازہری ندوۃ العلماء کے بڑے اساتذہ میں سے تھے، انہیں دینی علوم اور عربی زبان و ادب میں مہارت حاصل تھی، وہ عربی زبان کی تدریس کا اچھا تجربہ اور تعلیم و تعلم سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔

مولانا ازہری ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور جامع ازہر قاہرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما میں استاد مقرر ہوئے، موصوف کو عربی زبان وادب میں خاص ملکہ حاصل تھا، وہ عربی زبان وادب کے علاوہ حدیث شریف کی کئی بڑی کتابیں صحیح بخاری و مسلم کا بھی درس دیا کرتے تھے، عربی زبان و ادب کے لکچرار کی حیثیت سے مدرسہ عالیہ کلکتہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں بھی تدریسی خدمات انجام دی تھی، ان کی علمی نشانیوں میں دروس الادب والمحاورۃ العربیۃ کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی، یہ کتاب مختلف مدرسوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہے، مولانا موصوف کو فتنہ قادیانیت کی سرکوبی میں اولیت حاصل تھی۔

مولانا ازہری کی ان ہی خصوصیات اور ان کی علمی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے اس شمارہ کو ان کے لیے مختص کیا گیا ہے، اس میں دیگر لکھنے والوں کے علاوہ ندوہ کے بڑے اساتذہ کے بھی خاصے مضامین ہیں جس سے مولانا موصوف کی علمی خدمات اور ان کی اہمیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے بالخصوص ناظم ندوۃ العلما وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، معتمد تعلیم مولانا واضح رشید ندوی، مہتمم ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی اور مولانا سید سلمان حسینی ندوی قابل ذکر ہیں، پچاس سے زائد مضامین کا یہ گنجینہ دلکش اور پراز معلومات ہے۔

سہ روزہ دعوت (خصوصی اشاعت اسلامی بینک کاری ایک متبادل مالی نظام):

مرتبین پرواز رحمانی، شفیق الرحمٰن، کاغذ وطباعت بہتر، صفحات ۱۷۸، قیمت خصوصی شمارہ ۳۵ روپے، پتہ: ''دعوت'' ڈی ۳۱۴، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

سہ روزہ اخبار دعوت اصلاحی اور تعمیری مضامین پیش کرتا رہتا ہے، اس نے وقتاً فوقتاً مسائل حاضرہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے خصوصی شماروں کی اشاعت کی ہے اور اس کے ذریعہ سے اہم اور پراز معلومات مقالات ومضامین شائع کیے ہیں، زیر نظر خصوصی شمارہ اسی طرح کی کوششوں کا ایک نمونہ ہے، اس بار ادارہ نے سودی لین دین کے نظام سے بچنے کے لیے اسلامی بینک کاری کا وسیع تر مفہوم بیان کیا ہے، مدیر رسالہ لکھتے ہیں اسلامک بینکنگ کا مطلب

ہے اسلامی اخلاقیات - اسی طرح اسلامی سیاست، اسلامی معاشرت، اسلامی تجارت اور اسلامی نظام تعلیم وغیرہ کا صرف ایک مفہوم ہے اور وہ ہے اسلامی اخلاقیات - اسلامی بینکنگ یا اسلامی نظام معیشت بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے، اسلامی اخلاقیات کا صرف ایک حصہ ہے۔

شمارے میں ۲۰ سے زائد مضامین ہیں جن میں تنوع بھی ہے، ابتدا ممتاز ماہر اقتصادیات ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کے پیغام سے ہے، جس میں انہوں نے اب تک کی اس طرح کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھانے کی اپیل کی ہے، ڈاکٹر موصوف کے ایک پرمغز مقالہ کا اقتباس بھی ہے جس میں انہوں نے سودی لین دین کے مضرت رساں پہلوؤں پر بحث کے علاوہ اسلامی بینک کاری کے منصوبہ بندی کی دعوت دی ہے اور اس کے لیے کئی مفید مشورے بھی دیے ہیں، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی کے مقالے سے منقول اقتباس بھی مفید اور پرازمعلومات ہے، مقالات کی ابتدا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے مقالہ سے کی ہے جس میں اسلام کے معاشی نظام کی اہمیت وضرورت کے ساتھ اس کے کچھ نکات پیش کیے ہیں، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اسلامک بینکنگ اور موجودہ بینکنگ کا موازنہ ومقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی بینکنگ کا نظام مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے رحمت اور باعث نجات ہے ''ہندوستان میں اسلامی نظام تکافل اجتماعی کا قیام'' پر ڈاکٹر ابوذر کمال الدین نے بحث کی ہے، معاون مدیر محمد صبغۃ اللہ ندوی نے اسلامی بینک کاری سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، ڈاکٹر وقار انور نے اسلامک بینکنگ کا تعارف اور ہندوستان میں اس کے فروغ کے امکانات تلاش کیے ہیں تو ڈاکٹر محی الدین غازی نے اسلامی مالیاتی اداروں میں نگراں شرعی ادارے کی ضرورت اور مطلوبہ کارکردگی کا احساس دلایا ہے، مفتی محمد تقی عثمانی کے ایک مضمون کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے ترجمہ کرکے شامل رسالہ کیا ہے، ایچ عبدالرقیب نے ہندوستان میں اسلامی معیشت و بنک کاری کی پیش رفت کا جائزہ لیا ہے ڈاکٹر شارق نثار نے بھی اسی طرح کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر محمد اقبال مسعود ندوی (کناڈا) کا ایک انٹرویو رسالہ میں شامل ہے جو ہندوستان میں اسلامی بینک کاری کے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے، دیگر مضامین میں بھی موضوع کا پورا پورا احاطہ کیا گیا ہے۔

غالباً اس خصوصی شمارہ کا مقصد اشاعت یہی ہے کہ اسلامی بینک کاری سے متعلق غلط فہمیاں دور ہوں اور اس کا مفہوم وسیع تر ہو کر سامنے آئے تا کہ لوگوں کے رجحان میں اضافہ ہو۔

سہ ماہی **دعوت القرآن**: مرتب ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت فی شمارہ ۲۵ روپے، سالانہ اندرون ملک ۱۰۰ روپے، بیرون ممالک ۱۳۰ امریکی ڈالر، پتہ: دعوت القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ریسرچ سنٹر، کلن کی لاٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸۔

دینی، دعوتی اور اصلاحی رسائل کی فہرست میں یہ نو وارد ہے لیکن اس کی ابتدائی خوش اسلوبی اور پرمغز مقالوں سے اس کے تابناک مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے، زیر نظر رسالہ کئی اچھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ رسالہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ریسرچ سنٹر کا ترجمان ہے۔

مجلّہ کا دوسرا شمارہ زیر نظر ہے اس کے موضوعات کا انتخاب سماجی اصلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے، غالباً اس رسالہ کا مقصد اور مدیر رسالہ کی مصروفیات بھی اسی طرح کی ہیں، اس کے مشمولات میں اسلاف و مشاہیر کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی تحریریں بھی عمدہ ہیں، پہلا مضمون ''زندگی اور اس کے تقاضے'' فاضل مضمون نگار نے قرآن کریم کی روشنی میں مقصد زندگی اور وجود کائنات کی وضاحت کی ہے، دوسرا مضمون مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کا نقل کیا گیا ہے جو ہندوستان میں تحریک اسلامی سے متعلق ہے، دیگر مضامین میں ہندوستانی سماج کی اصلاح، مولانا حمید الدین فراہی اور اسالیب القرآن، مسابقۂ درس قرآن کی ضرورت و اہمیت، مطالعہ حدیث کی اہمیت، ذرائع ابلاغ کی ضرورت و اہمیت اور اسلامک فقہ اکیڈمی کا تعارف وغیرہ ہیں، تمام مضامین موضوع و مواد کے لحاظ سے مفید اور معیاری ہیں، امید ہے کہ اس مجلّہ کی پذیرائی شایان شان ہوگی۔

ماہنامہ ھدیٰ (خصوصی شمارہ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ نمبر): مدیر احمد مصطفیٰ صدیقی راہی، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۳۶۸، قیمت خصوصی شمارہ ۷۵ روپے، پتہ: ناظم ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ ۹۶ (بیسمنٹ) چرچ روڈ، بھوگل نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴۔

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی تاریخی اہمیت، اس کی پاکیزگی اور عظمت مسلم ہے، قبلہ اول ہونے کی جسے عظمت حاصل ہو اس کے تقدس کے بارے میں کچھ کہنے کی چنداں ضرورت

نہیں، اس سرزمین کی ایک تلخ کہانی بھی ہے لیکن موجودہ دور کے مسلمان عام طور پر اس سے ناواقف ہیں، صہیونی مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو ارض مقدس پر قبضہ کرکے اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے، مسجد اقصیٰ آج تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہے اور یہودی سازشوں میں گھری ہوئی ہے، ان کی بدترین جدوجہد اسے شہید کرنے کی ہے تاکہ وہاں ہیکل سلیمانی تعمیر ہوسکے، اسی مقدس سرزمین کے لیے مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی نے متحدہ مسیحی طاقتوں کا یک وتنہا مقابلہ کرکے اسے آزاد کرایا اور اس آزادی کی بقاو تحفظ کے لیے بھرپور جدوجہد کی، آج پھر اس کی بے حرمتی ہورہی ہے اور اس کے تقدس وعظمت کو پامال کیا جارہا ہے۔

اس خصوصی شمارہ کا مقصد عوام کو اس کی تاریخ سے واقف کرانا ہے تاکہ اس پاک سرزمین اور مقدس گھر کو وحشت و درندگی سے بچانے کے لیے ہماری کیا ذمہ داری اور فرائض ہیں، ان سے واقفیت حاصل کی جائے اور اس کے تحفظ کی کیا صورت ہو اس کے لیے لائحۂ عمل مرتب کیا جاسکے۔

عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ-۱: مدیر ڈاکٹر ایم-نسیم اعظمی، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۳۶۲، زرتعاون ۱۵۰ روپے، غیر ممالک سے ۲۵ پونڈ/۳۰ ڈالر، پتہ: ڈاکٹر ایم-نسیم اعظمی، مدیر ادبی گزٹ، عدلیہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، کساری، مئوناتھ بھنجن، یوپی ۲۷۵۱۰۱۔

مئو میں علم وادب اور مذہبی تعلیم کی تاریخ رہی ہے، یہاں عالموں، ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے، مختلف مکاتب فکر کے مدارس کی موجودگی اس کی فضاؤں میں علم وادب کی ترقی میں معاون ہے، ادبی گزٹ ان ہی خوبیوں کا نتیجہ ہے، اس کا پہلا شمارہ ہی موضوعات کے حسن انتخاب کا نمونہ ہے، مختلف مضامین کے لکھنے والوں کی محنت عیاں ہے، یہ ادبی رسالوں کی فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، زیرنظر شمارہ کئی بہترین ادبی مباحث اور عمدہ شعری انتخاب پر مشتمل ہے، ملک کے مقتدر رسالوں میں نمایاں مقام حاصل کرسکتا ہے۔

ت-ا-ندوی

مطبوعات جدیدہ

طہارت قلب: مرتبہ مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۲۴۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دار المعارف بی/۶۳۹، وصی آباد، الہ آباد یوپی۔

مولانا تھانویؒ کے خلیفہ اور جانشین شاہ وصی اللہ فتح پوری اپنے ہم عصر علماء و مشائخ میں اس لیے ممتاز تھے کہ ان کے دامن تربیت وارشاد سے عوام وخواص یکساں طور پر وابستہ رہے اور اس کی بڑی وجہ ان کے دل میں اسلام کا درد اور ان کی زبان کی خداداد تاثیر تھی، زہد و ورع اور ذکر و شغل کے ساتھ احترام شریعت اور علم و فہم کے اجتماع نے ان کی شخصیت کو بڑی دلآویزی عطا کی تھی، گفتگو اور تقریر کے ساتھ انہوں نے قلم اور تحریر کو بھی اصلاح و تزکیہ نفس کے لیے نہایت خوبی سے استعمال کیا، ان کے ایک عقیدت مند کو ان میں مولانا انور شاہ کشمیری کا تبحر علمی اور دقیق نکتہ رسی نظر آئی تو یہ محض عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ واقعہ ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی حقیقت کا اظہار ہے جس میں شاہ صاحبؒ کے تین اصلاحی رسائل کو یک جا کیا گیا ہے، موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ قلب کی پاکیزگی اور حسن اخلاق و مکارم اخلاق کا نمونہ بننے کے لیے رذائل کی صورت و کثافت سے واقف ہونا ضروری ہے، نفاق، کبر، خود پسندی اور حسد قلب کا سکون ہی نہیں غارت کرتے قلب کو سیاہ بھی کر جاتے ہیں اور جب قلب فاسد اور ناکارہ ہوتا ہے تو وجود انسانی کا فساد امر بدیہی ہے، اس مفید اور بے حد موثر کتاب کے مضامین میں اسی فساد کے ازالہ کی دوائے شافی تجویز کی گئی ہے، آیات و احادیث مبارکہ اور علماء و محدثین کے اقوال کی دلکش ترجمانی نے اس کتاب میں عام قاری کے علاوہ خطیبوں اور واعظوں کے لیے پرکشش بنا دیا ہے، جگہ جگہ فاضل مرتب کے افادات حسب معمول مزید لطف کا سبب بن جاتے ہیں، کتاب ہر عالم و عامی کے ہاتھوں میں جانے کے لائق ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی، حیات اور کارنامے: از ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۵۲، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، ڈی ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلائی دہلی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے شاگرد، ندوے کے قابل فخر فرزند اور مولانا ابوالاعلی مودودی

کے دست و باز و مولانا مسعود عالم ندوی نے صرف چوالیس سال کی عمر پائی یعنی وہ شعلہ مستعجل اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں دولت مستعجل تھے لیکن ان کی خوش درخشید گی، کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی اوراس کا ثبوت یہ کتاب ہے، ندوۃ العلماء کے عربی رسالہ الضیاء سے ان کی ضیاپاشی ہندوستان وعرب کوروشن کرگئی، مولانا علی میاںؒ نے ان کو برصغیر کا سب سے بڑا عربی انشاپرداز قرار دیا، اس سند سے بڑھ کر اور کیا سند ہوسکتی ہے، اس کے باوجود مولانا مسعود عالم ندوی کے احوال وآثار سے خدا جانے کیوں اعتنا کم بلکہ بہت کم کیا گیا اسی احساس نے زیرنظر کتاب مرتب کرنے کا جذبہ پیدا کیا، لائق مرتب نے صحیح لکھا کہ اس کمی کی وجہ یہ بھی ہے کہ مولانا کے حالات زندگی بہت کم کسی کو معلوم تھے، بغداد کے ایک ادیب طٰہٰ فیاض نے ایک بار خود مولانا مسعود عالم ندوی سے ان کی زندگی کے متعلق دریافت کیا تو ان کا جواب یہی تھا کہ میری کوئی زندگی نہیں اور نہ سوانح حیات ذکر کے قابل ہیں، اس کے باوجود اس کتاب کے مرتب نے بڑی محنت سے ایک ایسا مرقع تیار کردیا ہے جس سے مولانا مسعود عالم ندوی کی شخصیت کے خدوخال واضح ہوگئے ہیں، ندوہ، خدابخش لائبریری اور جماعت اسلامی تک کے سفر کے نقوش ہیں اور ایک بلند پایہ عربی ادیب کی حیثیت سے جائزہ بھی ہے، ایک باب میں اہل علم کے تاثرات ہیں تو ایک باب میں ان کے چند منتخب مضامین اور پھر خطوط بھی سلیقے سے پیش کیے گئے ہیں، آخری باب میں مولانائے مرحوم کی چند کتابوں جیسے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مولانا سندھی اور ان کے افکار وخیالات، محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم وبدنام مصلح، دیارعرب میں چند ماہ وغیرہ کا تعارف ہے، افسوس ہے کہ ایک عمدہ کتاب کا ذکر بڑی تاخیر سے ان صفحات میں آیا، اس کے لیے لائق مصنف اور پبلیشر سے معذرت اور عفوخواہی ہی کی جاسکتی ہے۔

کلیلہ ودمنہ ایک تحقیقی مطالعہ: مرتبین ڈاکٹر عائشہ کمال، ڈاکٹر محمد حسان خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۴۶، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ دین و دانش، ۱۳- مسجد شکور خاں روڈ بھوپال اور شعبہ عربی برکت اللہ یونیورسٹی ہوشنگ آباد روڈ بھوپال، ایم پی۔

ابن المقفع کی کتاب کلیلہ ودمنہ عربی ادب میں اتنی مشہور ہوئی کہ اس کو بہتوں نے اصلاً

عربی ادب ہی نہیں عربی ذہن وفکر کا نتیجہ سمجھ لیا، حالانکہ عربی لباس میں یہ کتاب ہندوستانی علم، فلسفہ اور اخلاق وآداب اور ثقافت کی یادگار ہے، عجیب بات ہے کہ اس کا اصل سنسکرت جسم تو معدوم ہوگیا، پنچ تنتر کے صرف پانچ قصے اس میں شامل ہیں، پہلے یہ ترجمہ فارسی زبان میں ہوا اور پھر عربی میں اور یہ اس شان کا ہوا کہ قریب پچیس زبانوں میں اپنے موضوع پر یہ بے نظیر کتاب عربی ہی سے منتقل ہوئی، عربوں کے ساتھ یہ کتاب جہاں پہنچی وہاں اس سے خاص اعتنا کیا گیا، عربی ادب میں اس پر برابر تحقیق جاری ہے لیکن امریکا اور یوروپ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کو خاص تحقیقی موضوع کی حیثیت حاصل ہے، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال کے شعبہ عربی نے ہندوستانی علم و ثقافت کی اس میراث کو عرب و ہند تعلقات کے استحکام کی غرض سے متعارف کرانے کی کوشش اس طرح کی کہ ایک سمینار اس موضوع پر منعقد کیا اور اب یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک بہترین اور شاید اولین کوشش ہے جس میں ابن مقفع کی زندگی اور کلیلہ ودمنہ کے تعارف کے علاوہ کلیلہ ودمنہ پر مختلف تہذیبوں کے اثرات، ان کی اہمیت، اس کے مقدمات، پنچ تنتر اور مہابھارت اور بدھ اساطیر جیسے عنوانات سے معلومات کا ایک دفتر پیش کردیا گیا ہے، ابن مقفع نے جن قصوں کا اضافہ کیا اور مختلف ایڈیشنوں میں جو قصے محذوف ہیں ان کا ذکر بھی بڑی تحقیق سے کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ یہ ابن المقفع کا کمال ہے کہ اس نے کتاب کے ترجمے کے ساتھ، یہودیت، عیسائیت، اسلام، بدھ مت اور مانی مذہب کے اثرات بھی منتقل کیے، اسی طرح جبر واختیار اور معتزلہ کی عقلی دقت آفرینیاں بھی اس میں سماگئیں، ایک باب کلیلہ ودمنہ کے مختلف تراجم کے تعلق سے ہے، کلیلہ ودمنہ کے موضوع پر داد تحقیق دینے والوں کے لیے یہ خاص طور پر بہت کارآمد اور معلومات سے لبریز ہے، قصہ نگاری کا ارتقاء خصوصاً ماقبل عہد اسلامی سے دور اسلام تک بھی دلچسپ ہے، ایسی مفید کتاب کی تیاری اور اشاعت کے لیے بھوپال یونیورسٹی کا شعبہ عربی قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔

بدرالدین طیب جی، یادیں اور تاثرات: از جناب حسن ضیاء، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۰۴، قیمت ۹۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۶۔

بدرالدین طیب جی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے کامیاب ترین اور ہردل عزیز

وائس چانسلر تھے، طلبہ کی نفسیات کو سمجھنے کی ان کی صلاحیت غیر معمولی تھی، قوت فیصلہ میں سریع بھی تھے اور شدید بھی، ان خوبیوں کی وجہ بھی تھی، جناب سید حامد نے لکھا کہ شرافت، ثروت، ذہانت اور نجابت نے طیب جی کی لیاقت کو دوآتشہ بلکہ چہار آتشہ کردیا تھا، یہ قلبی تاثرات بھی ہیں اور عینی شہادت بھی، اس میں تو شک نہیں کہ آزاد ہندوستان کے غیر معمولی آزاد طبائع میں بدرالدین طیب جی کی شخصیت یاد کرنے اور رکھنے کے لائق ہے، فکر ونظر کے اختلاف سے انکار ممکن نہیں تاہم ایسی شخصیات کا مطالعہ کم از کم جدید ہندوستان کی تاریخ بلکہ مسلم تاریخ میں کیا جانا چاہیے، اس کتاب میں سید حامد، طاہر محمود، ہاشم قدوائی، اقبال انصاری، اطہر صدیقی، سید عبدالباری، پروفیسر عبدالمغنی، سید شہاب الدین اور خوشونت سنگھ جیسے مشاہیر کی تحریریں شامل ہیں، فاضل مرتب کی تحریر مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے، ان کا یہ معروضی نقطہ نظر پسند آیا کہ ''.......... افسروں والی شان وشوکت اکثر غرور کی حد کو چھوتی خود پسندی اور خواص پسندی کے سبب وہ عام لوگوں کے ساتھ شناخت نہیں قائم کرسکے لیکن ان کے افکار ونظریات کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا'' ہندوستانی مسلمانوں کے راہ نما طبقے کے مطالعہ وتجزیہ میں یہ مجموعہ مضامین مددگار ہوسکتا ہے۔

تاریخ افغانستان وشیشان: از مولوی کلیم صفات اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: البدر بک سنٹر، سرائے میر، اعظم گڈھ۔

افغانستان کی تاریخ سے ہندوستانی مسلمانوں کو ہمیشہ سے دلچسپی رہی، غیرت وحمیت، جواں مردی، مذہبی جوش اور آزاد فضا میں زندگی گزارنے کی عادت اور دوسروں کے تسلط سے نفرت کی خصوصیات اس لائق ہیں بھی کہ ہمیشہ ایسی قوم کی بات کی جائے، ادہر افغانستان جن حالات سے گذرا ہے اور گذر رہا ہے اس نے اسلامی ہی نہیں عالمی پیمانے پر ایک نئی تاریخ رقم کرنے کی دعوت دی ہے، یہ صحیح ہے کہ ماضی کے افغانستان پر اردو میں کتابیں موجود ہیں لیکن ضرورت تھی کہ نئے سرے سے اس تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، دارالمصنفین کے نوجوان اور نوخیز رفیق اور اس کتاب کے مصنف نے معارف میں اس کا آغاز کیا تو اس کو قدر کی نظر سے دیکھا گیا، انہوں نے ان مضامین کو اور وسعت دے کر زیر نظر کتابی شکل میں شائع کردیا، چیچنیا یا شیشان کل تک سوویت روس کی اس ریاست سے عموماً ناواقفیت تھی لیکن کمیونسٹ روس کی شکست وریخت کے بعد اسلامی اقدار ونظریات کے تحفظ کے

لحاظ سے اس ریاست کا ذکر خاص طور پر ہونے لگا، لائق مصنف نے افغانستان کے ساتھ شیشان کو شامل کر کے کتاب کی افادیت کو بھی دوگنا کر دیا، ان کو یہ احساس بھی ہے کہ کسی ملک وقوم کی اصل تاریخ، وہاں کی علمی وتمدنی زندگی سے عبارت ہے، بقول ان کے ''کتاب میں ان ہی جلووں کی نمائش کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے'' یقیناً یہ کتاب ان دونوں ملکوں کے سیاسی حالات کے ساتھ وہاں کے علمی و تمدنی آثار کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

قاتل لمحے: از جناب تشنہ اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۴۴، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: دانش محل امین آباد پارک، لکھنؤ اور سید تشنہ اعظمی، دین دیال نگر 538KHA/43 کھدرا، لکھنؤ ۲۲۶۰۲۰۔

تشنہ اعظمی اگرچہ ابھی نوجوان ہیں لیکن مشاعروں میں اپنی خوش آوازی اور خوش کلامی سے ایسی شناخت بنا چکے ہیں کہ بزم شعر میں نو وارد نہیں کہے جاسکتے، ہمارے پیش نظر ان کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے لیکن پہلی غزل کے پہلے شعر سے تیور یہ ہے کہ

کیسے کہوں کہ آخری اپنی اُڑان ہے اس آسماں کے بعد بھی اک آسمان ہے

ان کے کلام کے متعلق ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کے تاثرات اچھے ہیں اور یہ کلام تشنہ کے لیے خوش آیند ہے، سلامت روی کے ساتھ مشق سخن جاری رہی تو خوب سے خوب تر کی امیدیں اور بھی بار آور ہوں گی

تم وہاں کے رہے ہم یہاں کے رہے اس طرح فاصلے درمیاں کے رہے

مینا کی آرزو نہ صراحی کی جستجو یوں بن گئے ہو صاحب ایمان کس لیے

اس معصوم سی دعا پر آمین کہنا چاہیے کہ

میرے اللہ مجھے ایسا سخن داں کردے نغمہ و شعر کی دنیا کا سلیماں کردے

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-**عہد نبوی کا تمدن:** پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، مجلد صفحات ۸۰۸، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱-حوض سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

۲-**اسلام میں عفت وعصمت کا مقام:** مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی، مجلد صفحات ۳۹۲، قیمت درج نہیں، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، مکتبہ الفرقان لکھنؤ، جامعہ امدادیہ، مرادآباد یوپی۔

۳-**الصحافة الاسلاميه فى الهند ، تاريخها و تطورها :** د-سلیم الرحمٰن خان ندوی، مجلد صفحات ۳۷۰، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: المجمع الاسلامی العلمی، ص-ب ۱۱۹، ندوۃ العلما لکناؤ، الہند۔

۴-**حدیث دوستاں:** مولف مولانا اعجاز احمد اعظمی، مرتب مولانا ضیاء الحق خیرآبادی، صفحات ۳۰۷، قیمت ۳۵۰ روپے، ناشر مکتبہ ضیاء الکتب، مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور، اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۱۲۱۔

۵-**حیات رسول کے درخشاں پہلو:** ڈاکٹر عایض القرنی، مترجم محمد رافع اعظمی ندوی، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۱۰ روپے، پتے مکتبہ ندویہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، کتب خانہ فخریہ دیوبند۔

۶-**اقبال اور الہ آباد:** علی احمد فاطمی، صفحات ۲۴۰، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: ادارہ نیا سفر، ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد۔

۷-**جوش کی شاعری کا فکری اور سماجی مطالعہ:** نعیم السحر صدیقی، صفحات ۲۹۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ادارہ نیا سفر، ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد۔

۸-**غزلیات شوکت بخاری تدوین وتقویم:** پروفیسر شاہ عبدالسلام، پروفیسر آصفہ زمانی، ڈاکٹر سید احسن الظفر، صفحات ۲۲۶، قیمت ۳۰۰ روپے، ناشر نصرت ناہید، لائبریرین امیر الدولہ پبلک لائبریری، قیصر باغ، لکھنؤ۔

۹-**حکیم سید ظل الرحمٰن-ایک مطالعہ:** ڈاکٹر فخر عالم، صفحات ۲۶۴، قیمت ۲۵۰ روپے، ابن سینا اکیڈمی، تجارہ ہاؤس، علی گڑھ۔



कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o HRD, Dept. of Higher Education, Govt. of India

Farogh-e-Urdu Bhawan

FC-33/9, Institutioanl Area, Jasola, New Delhi-110025. Ph.:49539000, Fax: 011-49539099

E-mail: urducouncil@gmail.com

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

- قومی اردو کونسل نے زیر ملازمت اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی کے لیے قلیل مدتی تربیتی کورس شروع کیا جس کو فی الحال دہلی میں شروع کیا گیا ہے بعد میں اسے اردو کے دیگر اہم مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، پٹنہ اور سری نگر سے بھی شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ قلیل مدتی تربیتی کورس اردو اخبارات کے صحافیوں کی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے شروع کیا گیا ہے یہ کورس جو 15 جنوری 2011 کو کلدیپ نیر اور عزیز برنی کے لیکچر سے شروع ہوا 6 مارچ 2011 کو مکمل ہو جائے گا۔
- قومی اردو کونسل نے ملک بھر میں پھیلے ہوئے اپنے کمپیوٹر تربیتی مراکز میں پڑھائے جانے والے کورس کا درجہ بڑھا کر اولیول ('O'Level) تک کر دیا ہے۔
- قومی اردو کونسل کا ٹیلی ویژن پروگرام اردو دنیا 8 جنوری 2011 سے ETV پر شروع کیا گیا۔ آدھے گھنٹے کا یہ ہفتہ وار پروگرام ہر سنیچر کو رات 8:30 بجے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے، اور ہر اتوار کی صبح 10:30 بجے اس کا دوسرا ٹیلی کاسٹ عمل میں آتا ہے۔ اس پروگرام میں اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرنے والی تقریبات کی جھلکیاں اور خبریں پیش کی جاتی ہیں۔
- قومی اردو کونسل اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت سے وابستہ تمام فنون لطیفہ مثلاً خطاطی، مصوری، غزل گائکی، فن تعمیر، سنگ تراشی وغیرہ ورثے کو محفوظ کرنے کی غرض سے ان سے وابستہ دانشوروں اور ماہرین کے ذریعے ایک 'اپروچ پیپر' تیار کر رہی ہے۔
- قومی اردو کونسل فارسی زبان میں ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس کا آغاز کرنے جا رہی ہے۔ یہ فارسی سرٹیفکیٹ کورس اردو کونسل کے عربی زبان میں چل رہے ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس کے طرز پر ہوگا جس میں داخلے کے لیے عمر یا تعلیمی لیاقت کی کوئی قید نہیں ہوگی۔
- قومی اردو کونسل نے اردو خطاطی اور طغرا نویسی کے قدیم روایتی فنون کو نئی ٹیکنالوجی اور تجارتی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے اور اردو تہذیب کے اس قیمتی سرمایے کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے 'کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائن کورس' کا درجہ بڑھانے اور دوردرشن کے اردو چینل ڈی ڈی اردو کے تعاون واشتراک سے ٹی وی پر اردو خطاطی سکھانے کا ایک پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
- کمپیوٹر پر رومن رسم الخط کے ذریعے اردو لکھنا پڑھنا سکھانے اور اردو زبان وادب کو آن لائن فروغ دینے کے لیے شروع کیا گیا قومی اردو کونسل کا یہ پروجیکٹ تکمیل کے آخری مرحلے میں ہے۔ یہ آن لائن اردو پروگرام جلد ہی شروع ہو جائے گا جس کی مدد سے پوری دنیا میں لوگ اردو زبان لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں گے۔
- قومی اردو کونسل ماس میڈیا اور فلم انڈسٹری سے اردو کے رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ان شعبوں سے تعلق رکھنے والے ملک کے تین اعلیٰ ترین اداروں میں اردو کے کم از کم ایک ایک طالب علم کو اسپانسر کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ اردو زبان کا پس منظر رکھنے والے اس طالب علم کے داخلے سے لے کر کورس کی تکمیل تک کے تمام اخراجات کونسل اٹھائے گی۔ کونسل فلم، ٹی وی اور پرنٹ میڈیا کے لیے الگ الگ اسکرپٹ رائٹنگ اور فلموں کے لیے سانگ رائٹنگ (Song Writing) سرٹیفکیٹ کورس، فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعہ شروع کرنے پر غور کر رہی ہے۔
- ان تعلیمی اداروں میں، جن کا تحقیق کا سابقہ ریکارڈ اطمینان بخش رہا ہے میجر ریسرچ پروجیکٹ دیا جائے گا اور ریسرچ چیئر / ریسرچ پروفیسرشپ قائم کی جائے گی۔
- مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ساتھ اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک مشترکہ ایکشن پلان تیار کیا جائے گا۔
- اردو زبان کے فروغ کی کوششوں میں مصروف اہم مصنفین کو امیر خسرو ایوارڈ دیا جائے گا۔
- حکومت کے تمام اسکولوں اور حکومت سے منظور شدہ اسکولوں میں اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائے جانے کو یقینی بنانے کے لیے CBSE سے رجوع کیا جائے گا۔
- دستور ہند کے (Article 30(Clause-I کے تحت اقلیتوں کے ادارے مثلاً اسکولوں اور کالجوں کی نیٹ ورکنگ کو یقینی بنانے کی کوشش کی جائے گی۔
- قومی اردو کونسل وزارت کے ICT پروجیکٹ کے اشتراک سے اردو سے دلچسپی رکھنے والے عوام کی بڑی تعداد کے لیے روزگار پیدا کرنے والی اسکیموں اور اردو سیکھنے والے پروگراموں کا فائدہ اردو داں حلقوں تک پہنچانے کی کوشش کرے گی۔
- قومی اردو کونسل نے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل سے یہ گذارش کی کہ کونسل کو ایسی Statutory Power دی جائے تاکہ کونسل فروغ اردو سے متعلق اپنی سفارشات ریاستی حکومتوں کو بھیج سکے اور ان سے Action Taken Report طلب کر سکے۔
- قومی اردو کونسل چاہتی ہے کہ وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام کے تحت اردو ٹیچر مہیا کرانے والی مرکزی کفالتی اسکیموں کے بہتر نفاذ اور ان کو لاگو کرنے اور نگرانی کی ذمہ داری کونسل کے سپرد کی جائے۔
- قومی اردو کونسل اردو کے فروغ کی حکمت عملی کے لیے ایک Road Map تیار کر رہی ہے جس کے خدوخال ایک Discourse سے وابستہ ہیں اور Protest کو Policy میں تبدیل کرنے کا عزم ہے تاکہ اردو بولنے والے عوام کی امیدیں دستور ہند کے مطابق پوری ہو سکیں، خصوصاً جن تحفظات کا احاطہ ,Article 29 Article 350 اور (Article 30 (Clasue I میں کیا گیا ہے۔